19401

ڈسپلن کی تعلیم و تربیت

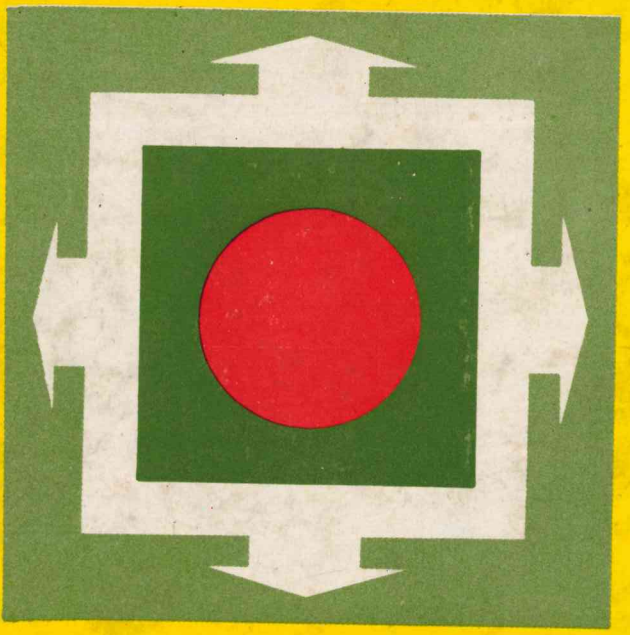

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

U
371.5
IkR

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ڈسپلن
کی
تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

Maulana Azad National Urdu University Library
Hyderabad.
Accn. No. 19101
Date 12 MAR 2007

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Huda
BOOK DISTRIBUTORS
A WORLD OF ISLAMIC BOOKS
Ph : 24411637, 24514892
455, Purani Haveli, Hyderabad-2, India.

U
371.5
IKR

© ڈاکٹر محمد اکرام خاں

Discipline Education,
Discipline Edu. at gross level,
Discipline Edu. for alls.

Maulana Azad National Urdu University Library
19101
2 MAR 2007

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ، ممبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001
پہلی بار: اکتوبر ۱۹۹۷ء تعداد: 500 قیمت = /90
لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

اپنے والدین کے نام

جن کی تعلیم و تربیت نے ہمت اور استقلال کے ساتھ
محنت کرتے رہنے کا سبق سکھایا

محمد اکرام خاں

فہرست مضامین

دیباچہ	پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی	۷
پیش لفظ	محمد اکرام خاں	۱۱
۱۔ ابتدائیہ		۱۳
۲۔ ڈسپلن کا مقصد		۱۷
۳۔ ڈسپلن کا مفہوم		۲۲
۴۔ ڈسپلن۔۔۔داخلی اور خارجی		۲۷
۵۔ ڈسپلن برائے جمہوری طرز زندگی		۳۵
۶۔ شخصیت کی نشوونما		۴۰
۷۔ شخصیت کی پہچان		۴۴
۸۔ اصول اور ضابطے کا تعین		۵۳
۹۔ چند اصلاحی تدابیر		۶۰
۱۰۔ والدین کے لیے چند ہدایات		۷۸
۱۱۔ اساتذہ کے لیے چند ہدایات		۸۸
۱۲۔ لازمی نتیجے پر مبنی طریقے کا استعمال		۱۰۰
۱۳۔ خود آموز ڈسپلن کی شناخت		۱۲۱
۱۴۔ کتابیات		۱۲۴

دیباچہ

یہ دیباچہ لکھتے وقت مجھے جھجک تو بہت ہو رہی ہے، مگر قلم رک بھی نہیں رہا۔ استاد کا حکم ماننا سعادت مندی کا تقاضا ہے مگر حکم اعزاز کو قبول کرنے کا ہو تو اس کی تعمیل تمام تر فخر ہے۔ اکرام صاحب ابتدائی مدرسے میں میرے استاد اور اتالیق رہے مگر اس کے بعد بھی کبھی میری نگرانی میں کمی نہ کی۔ ہاں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرزنش اور حوصلہ افزائی دونوں کے طرز بدلتے رہے۔ اب بیک وقت سرزنش اور حوصلہ افزائی کا بھی انھوں نے ایک طریقہ نکال لیا اور وہ یہ کہ میں ان کی کتاب ''ڈسپلن کی تعلیم و تربیت'' پر دیباچہ لکھوں۔ ان سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں ان کا سب سے زیادہ ڈسپلن شکن، بے پروا اور اول جلول قسم کا شاگرد ہوں اور طالب علمی کے زمانے سے آج تک اپنی اس ڈگر پر نہایت ثابت قدم رہا ہوں اور اب جب کہ خیر سے ۳۵ برس سے زیادہ خود استاد کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں اور طالب علموں میں اپنے اس لاابالی پن کا سکہ جما چکا ہوں تو یہ سرزنش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اب تک جو نہ سیکھ سکا اس پر کم از کم سوچوں تو سہی۔ دیر ہو گئی تو ہو گئی اندھیر تو نہ ہوا۔۔۔ اور حوصلہ افزائی اس بات کی کہ جو کچھ بھی تمام عمر میں اپنی اوقات کے مطابق سیکھ سکا، اسے انھوں نے اس حد تک شرف قبولیت بخشا کہ اسی کی بنا پر مجھے اس غیر معمولی اعزاز کے لائق سمجھا۔

اس کتاب کے قارئین وہ اساتذہ ہوں گے جو آج جب کہ عیسیٰ مسیح کی ولادت کے دو ہزار سال پورے ہونے کو ہیں، آنے والی نسلوں کے ذہن و کردار کی تربیت کی ذمہ داری سنبھالیں گے اور ان کے ذریعے یہ سلسلہ آیندہ ہزاروں سال تک جاری رہے گا۔ سنا ہے کہ قدیم ترین تحریر جو اب تک پڑھی جا سکی ہے وہ مصر میں محفوظ ہے۔ یہ اس زمانے کے ایک استاد کا بیان ہے جس کا مفہوم ہے کہ آج کل کے لڑکے برباد ہو گئے ہیں، پہلے ایسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ اگر یہ تحریر برآمد نہ ہوتی تو تجربے، مشاہدے اور اندازے کی بنا پر بھی بہ آسانی کہا جا سکتا

ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنے برے بھلے معیاروں میں پلنے بڑھنے کے بعد انھیں اتنا مقدس سمجھنے لگتے ہیں کہ ان سے انحراف میں انھیں آنے والے زمانے میں ساری انسانیت کی بربادی نظر آنے لگتی ہے' مگر سچ تو یہ ہے کہ اس انحراف نے ارتقا کی کڑیوں کو جوڑے رکھا اور اسی سے انسان اور انسانیت کی آبرو آج بھی باقی ہے۔ سولی پر چڑھنے والے' زہر کا پیالہ پینے والے' دیس نکالا پاکر دربدر ہونے والے' آبا و اجداد کے خداؤں کی پرستش سے انکار کرنے والے' جابر حکومتوں اور سماجوں سے بغاوت کرنے والے' سب وہ تھے جنھوں نے اپنے زمانے کی اقدار کو توڑ کر نئی دنیاؤں کی تعمیر کی۔ اب سوچیے کہ صدیوں کی بنی بنائی ڈسپلن کو توڑنا ہی وہ شرف ہے جسے حاصل کرنے کی تمنا ہر سمجھ دار شخص کو کرنی چاہیے تو پھر "ڈسپلن کی تعلیم و تربیت" کا کیا مطلب؟

یہ کتاب دراصل اسی سوال کا جواب ہے۔ ڈسپلن نئی نسل کے اندر کروٹیں لینے والی بے چینیوں اور بغاوتوں کو بجھانا' انھیں پسپا کرنا نہیں بلکہ ان کو سمجھنا اور ہر فرد کی ذات میں دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینا ہے۔ اکرام صاحب نے تفصیل کے ساتھ مختلف ابواب میں موجود عہد کے طالب علموں کے بارے میں عام شکایات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات نہایت عالمانہ تجزیے کے ساتھ عیاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر نئی نسل اپنی نشوونما کے دور میں قوت نمو' تحرک اور لچک سے قدرتی طور پر مالا مال ہوتی ہے۔ اس سے عام طور پر پرانی نسل اس لیے ساز نہیں کر سکتی کہ خود وہ دھیرے دھیرے انجماد کی منزل کی طرف رواں ہوتی ہے۔ سرد اور ٹھٹھری ہوئی شخصیتیں نئی نسلوں کی تربیت کا حق ادا نہیں کر پاتیں لہٰذا استاد کی شخصیت کے اندر زندگی کی حرارت اور نئی نسل سے سرگرم ربط ضبط رکھنے کی صفت لازم ہے کیونکہ اگر زمانے کے بندھے ٹکے نظام اقدار سے انحراف میں ارتقا کا راز پوشیدہ ہے تو ہزاروں سال کے تجربات اور مشاہدات سے استفادہ کرنے پر انسانیت کی بقا کا انحصار ہے۔ آج ٹکنالوجی کے چیلنج کا جو خوف ساری دنیا کے لوگوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے' اس سے نمٹنے کی صرف یہی امید ہو سکتی ہے کہ آنے والی نسلیں ہر قسم کے نئے اور پرانے جبر سے بغاوت کرنے اور ٹکرانے کی صلاحیت رکھتی ہوں اور ان کی آنکھوں میں وہ خواب اور ذہنوں میں وہ آئیڈیل بھی زندہ رہیں جو ہزاروں سال کے ریاض اور مشقت سے انسان نے حاصل کیے ہیں۔ تحفظ و بقا (Conservation) اور انحراف (Departure from the Traditional Ways)

دونوں ہی ہر زمانے میں ارتقا کا لازمہ رہے ہیں اور آج ڈسپلن کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی اس احساس کی ضرورت ہے۔

اکرام صاحب کی اس کتاب کا مرکزی نقطہ بچے کی "داخلی ڈسپلن" ہے اور اس کے لیے اساتذہ میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے اس کی تربیت کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس راہ کی ضرورتوں اور مشکلوں کا احاطہ کرتے وقت، عہد حاضر کے تناظر پر خود اپنے اور دوسرے اساتذہ کے تجربات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اکرام صاحب ڈسپلن کے روایتی اور قدامت پسند نقطۂ نظر کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک "ڈسپلن یہ ہے کہ بچہ خود اپنے وجود، اپنے تشخص، اپنی عزت اور اپنی خودی کو اپنے ہاتھوں اس طرح خاک میں ملادے کہ اسے پھر کسی موڑ پر اپنے اس زیاں کا احساس نہ ہو"۔ ان کے نزدیک وہ ڈسپلن درکار نہیں "جو حکم و تشدد یا سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے قائم کیا جاتا ہے، بلکہ وہ ڈسپلن جس کی بنیاد بچے کی نفسیات اور ضرورتوں پر ہوتی ہے۔"

یہ کتاب اسی منزل کی طرف اساتذہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ اردو میں اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کے پیچھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کے برسوں کے تجربات ہیں۔ جامعہ اور خصوصاً اس کے شعبۂ تعلیم کا یہ امتیازی وصف ہے۔ یہاں تعلیم سے متعلق جو نئے سے نئے تجربات کیے جاتے رہے ان کے نتائج کو اردو میں شائع کیا گیا، جس سے اردو کے علمی خزانے میں قابل قدر اضافہ ہوا اور اردو ذریعۂ تعلیم کی ضرورتوں کو بھی پورا کیا گیا۔ مجھے امید ہے کہ "ڈسپلن کی تعلیم و تربیت" کتاب اردو حلقوں کے باہر بھی ترجمے کے ذریعے پہنچ کر مقبول ہوگی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

۱۰ / جون ۱۹۹۷ء

پیش لفظ

''ڈسپلن کی تعلیم وتربیت'' کے مطالعے سے زیر تربیت استادوں' استادوں اور والدین کو بچوں کی تعلیم وتربیت کے کام میں رہنمائی حاصل ہوگی۔ وہ یہ سمجھ سکیں گے کہ شیر خوارگی اور بچپن کے دنوں میں جو اچھی یا بری عادتیں بن جاتی ہیں وہ آگے آنے والے دنوں میں بدلتی نہیں ہیں اور اگر بدلتی بھی ہیں تو فرد کی ذاتی توجہ اور کوشش سے عارضی طور پر بدلتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ بچے کے کردار کو شروع ہی سے سوچ سمجھ کر بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی جائے۔

کوئی تعلیمی کام ہو یا تربیتی' اس کے کرنے اور کرانے والوں کو کام کی نوعیت اور مقصد کو جاننے اور سمجھنے کے بعد ہی اسے بہ حسن وخوبی انجام دینے میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے کتاب کے شروع میں ڈسپلن کے مفہوم اور مقصد کو واضح طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ ڈسپلن دراصل نام ہے اس تربیت کا جو محبت اور صبر و تحمل کے ساتھ کی جاتی ہے اور جس کا مقصد خود بچے کی اور دوسروں کی ترقی اور فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ یہی وہ تربیت ہوتی ہے جو بچے کو منزل بہ منزل انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تدریس کی طرح رہنمائی کی کامیابی بھی نفسیات کے اصولوں کی روشنی چاہتی ہے۔ ہم نے ڈسپلن کی تعلیم وتربیت کے کام میں بچے کی فطرت اور اس کی نشوونما کے عمل کو سمجھانے کے بعد نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جمہوری طرز زندگی کا یہ مطالبہ کیوں ہے کہ خود آموز ڈسپلن سکھایا جائے اور اسے سکھانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اصلاحی تدابیر کے صرف نام ہی نہیں گنوائے گئے ہیں بلکہ انھیں استعمال کرنے کے لیے یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ پہلے شرارت کے مقاصد کو جانا پہچانا جائے' پھر محبت'

ہمدردی اور ہمت افزائی کے ساتھ ان میں اعتدال پیدا کرایا جائے۔ یاد رہے کہ بچے کی کوئی بھی شرارت بے مقصد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کوئی مقصد بہت سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ مقصد میں اعتدال پیدا کرایا جائے۔ اصلاحی تدابیر کے استعمال کی وضاحت کے بعد چند خاص ہدایات بھی پیش کی گئی ہیں۔

ہمارے یہاں ڈسپلن کی تعلیم و تربیت کے لیے عام طور سے انعام اور سزا کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے اس طریقے کے استعمال کے اچھے اور برے اثرات کو سمجھانے کے بعد اپنے ذاتی تجربے اور مطالعے کی روشنی میں نتیجے پر مبنی طریقے کے استعمال پر زور دیا ہے اور اس کے استعمال اور اثرات کی وضاحت کے لیے جو مثالیں بطور حوالے پیش کی گئی ہیں وہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں جو تقریباً پچاس پچپن برس پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقامتی مدرسہ، مدرسہ ابتدائی کی چوتھی یا پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ کتاب کے آخری باب میں کردار کی وہ چند خوبیاں یا شخصیت کے وہ چند اوصاف بیان کیے گئے ہیں جن کی بدولت آدمی کو انسانیت کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

میں بہت خوش ہوں کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے میرے اصرار پر کتاب کا دیباچہ لکھا۔ میری طرح قارئین بھی یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ''ڈسپلن کی تعلیم و تربیت'' کا دیباچہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سے محض اس لیے نہیں لکھایا گیا ہے کہ وہ ان طلبہ میں سے ایک ہیں جن کی تعلیم و تربیت سے متعلق مثالوں کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے بلکہ اس لیے لکھایا گیا ہے کہ انھوں نے بچپن ہی سے آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کو عقل کا تابع بنا کر اپنی شخصیت میں وہ اوصاف بدرجۂ اتم پیدا کیے ہیں جن کی بدولت ان کا شمار اپنے عہد کے بہترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔

آخر میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ انھوں نے ڈسپلن کی تعلیم و تربیت کی کمی کو محسوس کیا اور ''ڈسپلن کی تعلیم و تربیت'' کو اساتذہ اور والدین کی رہنمائی کے لیے مفید سمجھ کر اسے شائع کیا۔ بہت بہت شکریہ شاہد علی خاں صاحب کی عنایت اور ہمت افزائی کا۔

محمد اکرام خاں

۱۴ر جون ۱۹۹۷ء

ابتدائیہ

یوں تو آج کل زندگی کے ہر شعبے میں ڈسپلن کی کمی نظر آتی ہے لیکن اسکولوں بالخصوص سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کے ڈسپلن کو دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے۔ طلبہ کی لاپروائی، بداخلاقی، بے ضابطگی اور بدسلوکی کو دیکھ کر تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے محبان وطن اس کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں کہ اسکولوں کا ڈسپلن کس طرح ٹھیک کرایا جائے۔ طلبہ کو ڈسپلن سکھانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سزا دینے والا استاد ظالم، خطاوار اور پولیس افسر کہلاتا ہے۔ آزادی دینے والا استاد غیر ذمہ دار اور بیکار سمجھا جاتا ہے۔ آخر کیا کیا جائے۔ ڈسپلن کے بغیر نہ تعلیم ہو سکتی ہے اور نہ تربیت۔ نہ طالب علم پڑھ سکتا ہے اور نہ استاد پڑھا سکتا ہے۔

دور جدید کے مفکرین تعلیم کا خیال ہے کہ زیر تربیت اور زیر ملازمت استادوں کو ایسا طریقۂ تدریس سکھایا جائے جو سزا اور انعام کے بغیر شریر اور مسئلہ خیز بچوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔ انہیں سکھایا جائے کہ وہ حاکم نما استاد بننے کے بجائے جمہوریت پسند استاد بننے کی کوشش کریں۔ وہ حاکمانہ رویے کے بجائے جمہوری رویہ اختیار کریں۔

کسی ایسی جماعت کو پڑھانا کوئی مشکل کام نہیں جس کے طلبہ کو خود پڑھنے کا شوق ہوتا ہے، جو تعمیری کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں، جو دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن ایسے نیک طینت اور فرشتہ خصلت بچوں کی جماعت ہوتی کہاں ہے۔ کون استاد یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی جماعت میں کوئی بچہ شرارت نہیں کرتا۔ ہر جماعت میں مختلف معاشی اور تہذیبی معیار کے گھرانوں کے بچے ہوتے ہیں اس لیے شریر اور مسئلہ خیز بچوں کا ہر جماعت میں ہونا لازمی امر ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ صورت حال بدلتی رہتی ہے۔ بدلتی ہوئی صورت حال میں طلبہ کے رویّوں میں تبدیلی آتی ہے۔ عام طور سے ناتجربہ کار اور بچوں کی نفسیات سے ناواقف استادوں کو شریر اور مسئلہ خیز بچوں کے ساتھ کام کرنے میں

زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پریشانی اور دشواری کو دور کرنے کے لیے مسئلہ خیز بچے کو پرنسپل صاحب یا ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیج کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طلبہ کے مسئلوں کو حل کرنے کی ذمہ داری ان کی نہیں بلکہ پرنسپل صاحب کی ہوتی ہے۔ اس طرز عمل کو ختم کرنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ استاد بچے کی فطرت سے واقف ہوں اور اس کے فطری رجحان کو دیکھ کر مسئلہ کا حل تلاش کریں۔ استاد یہ مان کر تدریسی اور تربیتی فرائض انجام دیں کہ سزا اور انعام کے ذریعہ کردار کی اصلاح نہیں کی جاتی بلکہ رہنمائی اور محبت کے ذریعہ کوشش کرنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ پریشانی اور دشواری کو دور کرنے میں پرنسپل صاحب کے بجائے گائڈنس کونسلر کی رہنمائی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے دوران بچوں کے انفرادی اور اجتماعی مسئلوں کو حل کرنے میں گائڈنس کونسلر کی رہنمائی اور مشورہ کی بدولت ثانوی تعلیم کا زمانہ زیادہ بار آور اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

تربیت یافتہ استاد خوب جانتے ہیں کہ جماعت میں مختلف صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے بچے ہوتے ہیں اور تعلیمی منصوبے ان کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق بنانے ہوتے ہیں اور جماعت کو تین چار ٹولیوں میں تقسیم کر کے ہر ایک ٹولی کو اس کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جاتا ہے۔ ایسا نہ کر سکنے کی صورت میں ڈسپلن کے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ رائج طریقۂ تدریس جس میں درسی کتابیں پڑھانے کے لیے استاد کی حیثیت حاکمانہ ہوتی ہے اور وہ اپنا حکم منوانے کے لیے انعام اور سزا کا استعمال جائز سمجھتا ہے، ڈسپلن قائم رکھنے یا ڈسپلن سکھانے کے لیے بالکل بیکار اور بے سود ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اکثر و بیشتر طلبا قبل از وقت اسکول جانا بند کر دیتے ہیں۔ جو طلبہ اپنے شوق یا والدین کے خوف سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے بھی ہیں تو ان میں سے بھی بہت سے استاد کی محبت، توجہ اور قبولیت سے محروم رہنے کے باعث چھُپ چھُپ کر شرارتیں کرنے لگتے ہیں اور پھر یہی بچے گھر، اسکول اور سماج میں ناپسندیدہ حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔

رائج نظامِ تعلیم میں کچھ استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود کو ترقی پسند اور آزاد خیال تصور کرتے ہیں اور حاکمانہ رویہ نہیں بلکہ دوستانہ اور جمہوری رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انتظامی پابندیوں کے مخالف اور جمہوری طریقۂ تدریس سے ناواقف ہونے کی بنا پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو ڈراتے دھمکاتے اور مارتے پیٹتے نہیں۔ جماعت کے

شور و غل سے انھیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ تو بچوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بچوں کو کسی کام کے لیے مجبور نہیں کرتے۔ اس قسم کے آزاد ماحول کے پروردہ بچے خود غرض بنتے ہیں۔ انھیں کسی دوسرے کی عزت اور آرام کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ اس قسم کی ترقی پسندی اور بے مہار آزادی سے زیادہ تر بچوں کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ ہمت شکن بچے بچپن میں بنیادی مہارتوں۔۔۔۔ لکھنا پڑھنا اور گننا سیکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کی دلچسپیاں عمر کے ساتھ ذاتی منفعت اور غیر سماجی کاموں میں بڑھنے لگتی ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے اچھے اسکولوں میں بچوں کی اچھی طرح ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ ان کے وہاں اکثر و بیشتر سرگرمیاں بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ وہاں تعلیم کو طفل مرکوز بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ان کے وہاں ڈسپلن سے متعلق مسئلے بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور اگر کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہو بھی جاتا ہے تو متعلقہ استاد سب سے پہلے اپنی کمزوریاں تلاش کرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ سبق کی تیاری میں تو کوئی کمی نہیں رہ گئی۔ سبق طلبہ کے عام معیار سے کم یا زیادہ تو نہیں ہے؟ سبق سے متعلق متن کی اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے یا نہیں؟ توضیحات کے ذریعے سبق کو سمجھنے میں مدد ملی ہے یا نہیں؟ جماعت کے تمام طلبہ کے ساتھ محبت کا یکساں سلوک رہا ہے یا نہیں؟ اس طرح استاد اپنے طریقۂ تدریس سے مطمئن ہونے کے بعد مسئلہ خیز بچے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اس کی جذباتی اور جسمانی صحت کا اندازہ کرتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ گھر پر کوئی غیر معمولی خوشی یا غم کی بات تو نہیں ہو گئی۔ وہ دیکھتا ہے کہ مسئلہ محض سطحی اور وقتی ہے یا سنجیدہ۔ مسئلہ کی نوعیت کو جان کر اس کو حل کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتا ہے۔ بچے کی نفسیات کو جاننے والے استاد ان کے تاثرات اور شرارتوں کے مقاصد کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں کرتے۔ وہ بہت جلد شرارت کے مقصد کو سمجھ کر بچے کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے عام بچوں کی طرح بنیادی مہارتوں کے سیکھنے میں دلچسپی پیدا کراتے ہیں۔

عام طور سے بچے کے ناپسندیدہ کردار یا شرارت کا مقصد توجہ اور محبت حاصل کرنا، اقتدار حاصل کرنا یا انتقام لینا ہوتا ہے، بعض بچے بالخصوص بچیاں خود کو بے بس اور بے ضرر جتا کر خاموش شرارتیں کرتی ہیں اور ان کا مقصد محض استاد کو پریشان کرنا ہوتا ہے۔ ان چاروں مقاصد کے علاوہ دوسرے مقاصد بالکل سطحی ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پر جو شرارتیں کی جاتی

ہیں وہ وقتی اور سطحی کہلاتی ہیں۔ استاد کو ناپسندیدہ کردار کی اصلاح کے لیے بچے کے مقصد کو جان کر اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

بڑوں کی طرح بچوں کو بھی اپنی اہمیت جتانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان سے محبت کی جائے۔ ان کو اہمیت دی جائے' ان کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ ان کو اپنایا جائے۔ وہ اپنی اس فطری خواہش کے تحت شروع میں مثبت اور منفی' تعمیری اور تخریبی دونوں طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کی مدد کرتے ہیں اور کبھی کسی سے نفرت' کبھی دوستی کرتے ہیں اور کبھی نفرت' کبھی تعاون سے کام لیتے ہیں اور کبھی عدم تعاون سے۔ کبھی اشتراکِ عمل کا ثبوت دیتے ہیں اور کبھی مقابلہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ شرارت کرتے وقت کوئی بچہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کو اپنے مقصد میں کامیابی ہی ہوگی وہ تو استاد کو پریشان دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت بچے کی شرارت کے مقصد کو پہچانے اور پھر مناسب طریقے سے اس میں اعتدال پیدا کرائے' استاد کو شرارت سے کہیں زیادہ مقصدِ شرارت کی بھلائی اور برائی سمجھا کر بچے کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ناپسندیدہ کردار کی اصلاح سے بچے کو ثانوی اور اعلا تعلیم کی منزل میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔

دنیا کے دوسرے تمام ملکوں کی طرح ہمارے یہاں بھی ابتدائی تعلیم کی منزل کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے لیکن ہم معاشرتی اور اقتصادی حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اس کی کمزوریوں اور خرابیوں کو دور نہیں کرپاتے۔ بڑی ضرورت ہے طریقۂ تدریس کو بدلنے کی۔ منصوبی یا مربوط طریقۂ تدریس کے ذریعے تعلیم دینے کی۔ تعلیم کو بامقصد اور دلچسپ بنانے کی۔ اسکولوں کے ماحول کو تعلیم کے لیے سازگار بناکر صحیح ڈسپلن سکھانے کی۔ استادوں کی تعلیم وتربیت کے دوران ان کو جمہوری طرز فکر اور جمہوری طریقۂ تعلیم سکھانے کی تاکہ وہ انعام کے لالچ اور سزا کا خوف دلائے بغیر بچوں میں پسندیدہ کردار پیدا کرا سکیں اور ان میں وہ مہارتیں اور عادتیں پیدا ہو سکیں جو موجودہ جمہوری نظامِ زندگی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

ڈسپلن کا مقصد

اچھے ڈسپلن کا بچے کی بالیدگی اور نشوونما پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔ اسے اظہارِ ذات کے مواقع ملتے ہیں۔ اسے اپنے جسم کی حفاظت کی فکر رہتی ہے۔ اسے دوسروں کے آرام اور حقوق کا احترام کرنا آتا ہے اور وہ اپنی امنگوں اور خواہشوں پر قابو پانے کے قابل بن جاتا ہے۔

زندگی کو پُرامن اور پُرسکون طریقہ سے بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص ان قواعد اور ضوابط کے مطابق عمل کرنا سیکھے جو کسی معاشرے کی عام بھلائی اور بہبود کے لیے مرتب کیے جاتے ہیں۔ مانا کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں یعنی روٹی، کپڑا اور مکان ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں لیکن کردار کے ضابطے سب جگہ یکساں نہیں ہوتے۔ ہر ملک، ہر علاقے اور ہر سوسائٹی کا طرزِ معاشرت جداگانہ ہوتا ہے مثلاً بھوک امریکن بچے کو بھی لگتی ہے اور ہندستانی بچے کو بھی۔ بھوک غریب بچے کو بھی لگتی ہے اور امیر بچے کو بھی، بھوک سب کو لگتی ہے۔ بھوک کو ختم کرنے کے لیے دودھ پلایا جاتا ہے اور کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ کسی ایک گھرانے کا بچہ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اٹھا کر کھالیتا ہے۔ کسی دوسرے گھرانے میں بچے کو صرف مقررہ اوقات میں کھانے کو دیا جاتا ہے اور صرف اتنا کھلایا جاتا ہے کہ بچے کی بھوک ختم ہو جائے۔ اسی طرح بعض گھرانوں میں بچوں کے سونے اور جاگنے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں اور بعض گھرانوں میں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی جاتی۔ سمجھدار اور مہذب والدین بچے کو شروع سے ہی نہایت صبر و تحمل اور محبت کے ساتھ ڈسپلن کی تعلیم دیتے ہیں۔

بچے کے کردار پر اس کے گھر کے ماحول کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ وہ دراصل اپنے بڑوں سے ہی سیکھتا ہے اور خاص طور سے ان بڑوں سے جن پر اسے بھروسہ ہوتا ہے اور جن سے اس کو محبت ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کو سب سے زیادہ بھروسہ اپنی ماں پر ہوتا ہے اس

لیے کہ اسے ماں کی بے لوث اور غیر مشروط محبت ملتی ہے۔ ماں کے بعد بچہ اپنے والد اور بڑے بھائی بہنوں سے سیکھتا ہے۔ یہی سب تو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں چنانچہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ڈسپلن کی تعلیم ماں کی گود اور گھر کے ماحول سے شروع ہوتی ہے۔

ڈسپلن کی تعلیم اور کردار سازی کے لیے عمر کے پہلے چھ برس بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ دراصل شخصیت کی بنیاد اسی عمر میں رکھی جاتی ہے۔ اس عمر میں جو عادتیں پیدا کرائی جاتی ہیں ان میں عمر کے دوسرے چھ برسوں میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے سال میں بچے کے جسم اور وزن میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی امی کی گود میں پھدک پھدک کر حرکی مہارتیں حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کو ہلا جُلا کر عضلات پر قابو پانے کے بعد بیٹھنا شروع کرتا ہے۔ اپنی بھوک اور دوسری احتیاجات کو رو دھو کر یا ہنس کر ظاہر کرتا ہے۔ سمجھدار ماں باپ بچے کے اشاروں کو سمجھ کر اس کی احتیاجات بروقت پوری کرتے ہیں۔ دودھ کے وقت دودھ پلایا جاتا ہے۔ سونے کے وقت سلایا جاتا ہے اور نہانے دُھلانے کے وقت نہلایا دُھلایا جاتا ہے۔ ایک برس کا ہوتے ہوتے بچہ سہارا لے کر کھڑا ہونا اور چلنا سیکھ لیتا ہے اور تھوڑا بہت بولنے بھی لگتا ہے۔ اس کے بعد حواسِ خمسہ اور دوسروں کی مدد سے اپنے گردوپیش کی چیزوں کو جاننے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کی حرکتوں اور شرارتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

جسمانی بالیدگی کے ساتھ سماجی نشوونما بھی ہوتی رہتی ہے۔ جب بچہ ماں کی گود چھوڑ کر چلنے پھرنے لگتا ہے اور دوسرے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کرتا ہے تو وہ ملنے جلنے اور بولنے چالنے کے آداب سیکھتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے کے لائق ہو جاتا ہے کہ جنگلی بلّی کاٹ لیتی ہے اور گرم چیز کو چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے۔ وہ دوسرے بچوں کے کھلونے تو لینا چاہتا ہے لیکن اپنی چیزیں دوسروں کو دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ لڑکے اور لڑکی کے جسمانی فرق کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی مصروفیت کو بھی تھوڑا بہت سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح تین برس کا ہوتے ہوتے بچہ سماجی اعتبار سے بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں تین برس کے بچے کو نرسری یا کنڈرگارٹن اسکول بھیجا جاتا ہے تاکہ تربیت یافتہ استانیوں کی نگرانی اور رہنمائی میں رہ کر اس کی شخصیت کی جسمانی، جذباتی، ذہنی اور سماجی اعتبار سے صحیح نشوونما ہو سکے۔

نرسری اسکول کی زندگی گھریلو زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہاں مختلف گھرانوں کے ہم عمر بچے ہوتے ہیں۔ نئی جگہ اور نیا استاد ہونے کی وجہ سے بچے کو شروع میں تھوڑی پریشانی ہوتی ہے۔ کچھ دن بعد استاد کی محبت سے متاثر ہو کر وہ اپنے نئے ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے لگتا ہے۔ سب کو تو نہیں ایک دو کو اپنا دوست بھی بنا لیتا ہے۔ نرسری اسکول میں بچے کی شخصیت کی نشوونما کے لیے جو کام کرائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے کردار سازی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کبھی اس کو اس کی مرضی کے مطابق کام نہ کرنے دینے سے تکلیف ہوتی ہے اور کبھی حسبِ منشا کام کرنے کی آزادی پا کر وہ بے حد خوش ہوتا ہے۔ کبھی کچھ بنا کر خوش ہوتا ہے اور کبھی کچھ توڑ کر۔ اس طرح استاد کی محبت اور رہنمائی اس کو جذبات پر قابو پانے اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنا سکھاتی اور باقاعدہ تعلیم کے لیے ابتدائی اسکول جانے کے لیے تیار کرتی ہے۔ نرسری اسکول میں بچے کو پسندیدہ کردار پیدا کرنے کا شوق دلایا جاتا ہے یعنی اس کی زندگی میں شروع ہی سے ڈسپلن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچے کی جذباتی نشوونما پر غلط اثر نہ پڑے اس لیے کہ جذباتی نشوونما کے بغیر زندگی میں ڈسپلن پیدا ہونا ممکن نہیں۔

بچہ فطرتاً آزادی کو پسند کرتا ہے۔ وہ آزادی سے کھیلنا کودنا پسند کرتا ہے۔ اس کی آزادی پر پابندی لگانا بظاہر برا معلوم ہوتا ہے لیکن پابندی کے بغیر آزادی اس لیے اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ بچہ اتنا سمجھدار نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا کھیل نہ کھیلے جس میں جسمانی چوٹ لگنے یا بدن کی کسی ہڈی میں فریکچر ہو جانے کا خطرہ ہو۔ مثلاً کسی اونچی دیوار پر چڑھ کر نیچے کودنا، کسی مکان کی منڈیر پر دوڑنا یا سڑک پر کرکٹ کھیلنا اور سڑک پر اسکیٹنگ کرنا وغیرہ۔ جسمانی چوٹ سے بچے کے جذبات بھی مجروح ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچے کی آزادی پر پابندی لگائی جائے۔ اسے ڈرائنگ روم میں رکھے صوفوں کے گدوں پر کودنے، ان کو ادھر ادھر پھینکنے، گھر کے صحن میں کرکٹ کھیلنے یا اسکیٹنگ کرنے سے بالکل نہ روکا جائے البتہ دیوار پر چڑھ کر کودنے اور سڑک پر کرکٹ کھیلنے سے جو نقصان ہو سکتا ہے اسے سمجھا کر ضرور منع کیا جائے۔ بچوں کی عمر کے مطابق ان کے کھیلوں میں رہنمائی کی جائے جو ماں باپ اور استاد بچوں کی قدم قدم پر نگرانی کرتے ہیں اور گرنے پڑنے یا معمولی معمولی چوٹوں سے ڈرا کر انھیں کھیلنے کودنے سے منع کرتے ہیں وہ دراصل اپنے بچوں کو بزدل اور ڈرپوک بناتے ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کھیل میں چوٹ نہیں لگے گی۔ ہو سکتا ہے کہ بچہ گھر کے صحن میں دوڑتے ہوئے گر جائے اور اس کے پیر کے انگوٹھے میں موچ آجائے یا نرسری اسکول میں کھیلتے ہوئے کوئی بچہ جھولے سے اس طرح گرے کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگے یا ایک سات آٹھ برس کا بچہ کھیل کے میدان میں کرکٹ کھیلتے ہوئے زخمی ہو جائے۔ کھیلوں میں چوٹ تو لگتی ہی رہتی ہے۔ ماں باپ اور استاد کا کام صحیح رہنمائی کرنا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ بچے کو صرف ایسے کھیلوں سے روکا جائے جو بظاہر خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔

جسمانی حفاظت کے علاوہ بچوں کو ذہنی اور جذباتی پریشانیوں سے بھی محفوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچے من موجی ہوتے ہیں اور نا سمجھ۔ وہ اپنی بعض خواہشات کو پورا نہ ہونے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور غصہ سے مغلوب ہو کر ناپسندیدہ حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد ڈرتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں۔ اب ان کے خوف اور پریشانی کو پیار و محبت کے ساتھ دور کرنا ہوتا ہے اور سمجھانا ہوتا ہے کہ غصہ بُری چیز ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے یوسف کو:

پانچ برس کے یوسف کو نہ تو نرسری اسکول جانے کا موقع ملا ہے اور نہ ہی گھر پر ڈسپلن کی تربیت کی گئی ہے۔ صبح ناشتہ پر اس کی امی اسے دودھ پلانا چاہتی ہیں اور وہ پیپسی کو لالینا چاہتا ہے۔ اپنی خواہش پوری نہ ہونے کی صورت میں یوسف روتا ہے اور دودھ بھرا گلاس فرش پر پھینک دیتا ہے۔ غصہ کی حالت میں اس کو یہ پروا نہیں ہوتی کہ فرش گندہ ہوگا گلاس ٹوٹے گا' امی ناراض ہوں گی اور ابو ماریں گے' لیکن غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ ڈرتا ہے' محسوس کرتا ہے کہ ابو اور امی خفا ہوں گے۔ غرض یہ کہ پریشان ہوتا ہے۔ نہ تو دودھ ملتا ہے اور نہ پیپسی۔ امی اور ابو کا پیار بھی نہیں ملتا۔ بس جو کچھ ملتا ہے وہ ہے ذہنی پریشانی اور جذباتی انتشار۔ یوسف کو ذہنی پریشانی اور جذباتی انتشار سے بچانے کے لیے پیار محبت کے ساتھ یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ناشتہ میں دودھ کیوں پلایا جاتا ہے اور خواہش کو پورا کرانے کا معقول طریقہ کیا ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اوپر تلے کے بھائی بہن ماں باپ کی موجودگی میں خوب لڑتے جھگڑتے اور طرح طرح کی شرارتیں کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ وہ جانتے ہیں کہ انھیں ماں باپ کی توجہ' محبت اور مداخلت حاصل ہوگی۔ سمجھدار والدین انھیں لڑنے جھگڑنے کی آزادی بھی دیتے ہیں اور چھوٹے کو بڑے کی جارحانہ حرکتوں سے بچانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ جب بڑا بچہ نارمل حالت میں ہوتا ہے تو اسے پیار سے یہ سمجھاتے ہیں کہ غصہ بچوں کو بھی آتا ہے اور

بڑوں کو بھی۔ غصہ تمھیں بھی آتا ہے اور ہمیں بھی لیکن غصہ کی حالت میں بے محل اور غیر سماجی حرکتیں کرنا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ کوئی شخص اکیلا رہ کر خوش نہیں رہ سکتا اور اکیلا رہنا ممکن بھی نہیں ہے۔ دوسروں کے ساتھ رہنے کے لیے غصہ کو مارنا ضروری ہے۔ دوسروں کی عزت، آرام اور حق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک کو دوسرے کی مدد کرنا ہوتی ہے عموماً گھر میں اور سماج میں وہی شخص زیادہ محبت اور عزت حاصل کرتا ہے جس کو اپنے غصہ پر قابو ہوتا ہے، جو دوسروں سے محبت کرتا ہے اور جو دوسروں کی عزت کرتا ہے۔

بچوں کی شرارتوں یا ناپسندیدہ حرکتوں پر انھیں مارنے پیٹنے یا خفا ہونے سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ وہ بزدل، ڈرپوک اور شرمیلے بن جاتے ہیں۔ ان کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ان کی عمر کے مطابق ایسے دلچسپ کاموں میں مصروف رکھا جائے جن کے ذریعہ ان کی ذات کا پورے طور پر اظہار ہو سکے۔

ڈسپلن نام ہے کردار سازی کا۔ کردار سازی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ماں باپ اور استاد اپنی زندگی کو مثالی بنائیں۔ گھر کے ماحول کو سازگار بنائے رکھیں۔ وقت کی پابندی خود بھی کریں اور بچوں سے بھی کرائیں۔ معمولات کی پابندی مستقل مزاجی سے کرتے رہیں۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں نیز پڑوسیوں غرض یہ کہ سب چھوٹوں بڑوں سے محبت اور عزت کے ساتھ پیش آئیں۔ اگر کسی صورتِ حال میں کوئی بدمزگی پیدا ہو جائے تو بچوں کے سامنے شرمندگی اور ندامت کا اظہار کیا کریں۔ غرض یہ کہ بچوں کو اپنے طرزِ عمل سے یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ غصہ کا آنا فطری عمل ہے۔ غصہ سب کو آتا ہے لیکن اچھا انسان وہی کہلاتا ہے جس کو اپنے غصہ پر قابو ہوتا ہے اور جس میں اپنے نفس کو مارنے کی قوت ہوتی ہے۔

ڈسپلن کا مقصد بچے کو حکم کا بندہ بنانا یا دوسروں کا غلام بنانا نہیں ہوتا۔ ڈسپلن کا مقصد بچے کو خوش اور مامون رکھنا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مقصد بچے کو آزاد خیال اور سمجھدار سماجی انسان بنانا ہوتا ہے۔

ڈسپلن کا مفہوم

"میں اپنے بیٹے کو ڈسپلن سکھانا پسند نہیں کرتا۔ بچپن تو ہوتا ہی ہے کھیلنے، کودنے اور تفریح کرنے کے لیے۔ بڑے ابا! اس عمر میں بچوں کو ڈسپلن سکھانے کے کیا معنی؟"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ بچوں کو کھیلنے، کودنے اور تفریح کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن انھیں ایسے کاموں سے ضرور روکنا چاہیے جو خود ان کے اور دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہو سکتے ہیں۔"

یہ ہے وہ گفتگو جو نوجوان اور آزاد خیال عتیق صاحب اور ان کے بوڑھے دادا کریم صاحب کے درمیان اس وقت ہو رہی تھی جب عتیق صاحب کا چار سال کا بیٹا ٹلو کھانے کے کمرہ کی دیواروں پر کوئلے سے الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر دیوار کو گندہ کر رہا تھا۔ اس گفتگو سے ڈسپلن کے جدید نظریے اور قدیم نظریے کو سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ضرور ملتی ہے۔ جدید نظریے کے حامی بچے کو بالکل آزاد ماحول میں پیار محبت کے ساتھ پروان چڑھانے کے قائل ہیں اور قدیم نظریے کو ماننے والے ایسی آزادی کے جس پر کوئی پابندی نہ ہو سخت مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بچہ فطرتاً شر پسند ہوتا ہے اس لیے اس پر پابندی لگانا اور اس کی نگرانی کرنا ضروری ہے۔ وہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ "بچے کو کھلاوے سونے کا لقمہ لیکن دیکھے شیر کی آنکھ سے"۔ یعنی کھلانے پلانے میں بالکل کمی نہ کی جائے لیکن برتاؤ کی سخت نگرانی کی جائے۔ بچے کو بالکل آزاد چھوڑنے کے معنی اس کو خراب کرنا ہے۔ بچے کو شروع ہی سے جیسے بھی ہو سکے سختی سے یا نرمی سے، غصہ سے یا پیار سے یہ سمجھانے اور سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ بالکل آزاد رہنا یا من موجی زندگی گزارنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایسے کاموں سے سدا دور رہنا چاہیے جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوں۔

تعلیمی حلقوں میں ڈسپلن کے مفہوم اور نظریے پر خوب خوب بحثیں ہوتی رہتی ہیں

اور ہوتی رہیں گی۔ کوئی کہتا ہے کہ ڈسپلن کے معنی ہیں بچے کو سختی اور نرمی یا سزا اور انعام کے ذریعہ قابو میں رکھنا۔ کوئی کہتا ہے کہ ڈسپلن کا مطلب تعمیل حکم سکھانا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ ڈسپلن کا مطلب یہ ہے کہ بچے کی عادتوں اور کردار کو اس طرح سدھارا جائے کہ وہ سماج میں رہ کر خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔ کسی کا خیال ہے کہ قواعد و ضوابط کی بے سوچے سمجھے پابندی کرنے کا نام ڈسپلن نہیں ہے بلکہ ڈسپلن کا مطلب ہے کہ بچے کو آزادی کے ساتھ نیک خیالات' صحت مند نظریات' پسندیدہ کردار اور اچھا اخلاق سکھایا جائے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ ڈسپلن کے عام فہم معنی جس پر عام طور سے اتفاق کیا جاسکتا ہے یہ ہیں کہ بچے کے کردار کو پیار محبت کے ساتھ سنوارا جائے۔ کردار کی خوبی ہی کسی فرد کو سماج میں مقبولیت اور عزت دلاتی ہے۔ ماں باپ اور اساتذہ کو یہی خوبی پیدا کرانی چاہیے۔ اس کام میں انھیں اس وقت پریشانی ہوتی ہے جب وہ بچے کو کوئی ایسا کام کرتے دیکھتے ہیں جو ان کے خیال میں دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔

زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ باضابطہ اور پُرسکون زندگی کے لیے ڈسپلن کا ہونا اشد ضروری ہے اور اس کی تربیت شروع سے ہی ہونی چاہیے۔ مثلاً چار پانچ برس کا یوسف اپنے ساتھیوں کے ساتھ گیند بلا کھیلتے ہوئے اپنی گیند اٹھانے کے لیے آنکھ بند کر کے سڑک پر دوڑا جاتا ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا ضروری ہے یا بارہ برس کا اختر اپنے گھر کے صحن یا اسکول کے کھیل کے میدان میں اس طرح کھیلتا ہے کہ اس کے کھیل کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا ضروری ہے۔ یا چودہ برس کا عاطف بغیر اجازت حاصل کیے اپنے والد کے کسی مہمان کی سائیکل اٹھا کر گھومنے نکل جاتا ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا ضروری ہے۔

یوسف کو پیار محبت کے ساتھ یہ سمجھانا چاہیے کہ سڑک کے قریب کھیلتے وقت اور آنکھ بند کر کے گیند کے پیچھے دوڑتے وقت کسی موٹر کار یا اسکوٹر سے ٹکرا کر جسم کے زخمی ہونے یا جان کے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اختر کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کھیلتے وقت دوسروں کے آرام اور خوشی کا خیال رکھنا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح عاطف کو یہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی کی چیز کو بغیر اجازت اٹھا لینے یا استعمال کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم و تربیت سے بچوں کو اپنے جذبات پر قابو پانے اور باضابطہ طور پر

زندگی بسر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان کی اپنی نشوونما پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔

ڈسپلن کے قدیم نظریے کے مطابق تو یہ کہا جاتا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ''سزا نہ دینے کے معنی بچے کو خراب کرنا ہے۔ اس خیال کے حامی ڈسپلن کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ بچے کو تعمیلِ حکم کی تعلیم دی جائے۔ اسے اپنے بزرگوں کے اشاروں پر ناچنا سکھایا جائے۔ اگلے زمانے سے جو قواعد و ضوابط چلے آرہے ہیں ان پر بے چون وچرا عمل کرنا سکھایا جائے اس لیے قدیم نظریے کے مطابق یوسف' اختر اور عاطف کو شریر مان کر انھیں جیسے بھی ممکن ہو قابو میں رکھنا بہتر ہوگا۔

جدید نظریے کے حامی قدیم نظریے کو بالکل بے معنی سمجھتے ہیں۔ وہ داخلی ڈسپلن (Internal Discipline) یا خود آموز (Self Discipline) کو پسند کرتے ہیں۔ وہ یوسف' اختر اور عاطف سے پیار اور محبت کے ساتھ پیش آکر ان کی شرارتوں کے اسباب جانیں گے اور پھر ان کے نتائج اور اثرات کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے یہاں بچے کو آزاد چھوڑ کر اس کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈسپلن سکھایا جاتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے یہاں ابھی تک اس جدید نظریے کو پوری طرح اور کھلے دل سے نہیں اپنایا جاسکا۔ درحقیقت بچے کے دل و دماغ پر محبت و مروت' شفقت اور قربت کا جو اثر ہوتا ہے وہ سختی' سزا اور بے رخی کا نہیں ہوتا۔ محبت اور شفقت کے بغیر شخصیت کی صحیح نشوونما اور کردار سازی کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر بچے کو اس کام کے لائق نہیں بنایا جاسکتا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ محبت اور شفقت سے بچے کے دل کی کلی کھلتی ہے اور اس کی پوشیدہ صلاحیتیں اور قوتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ قدیم نظریے کے مطابق ڈسپلن میں رہنے والا بچہ عام طور سے خود غرض اور غیر سماجی انسان بنتا ہے اور جدید نظریے کے مطابق وہ دوسروں کا ہمدرد اور اچھا سماجی انسان بنتا ہے۔

ڈسپلن کے جدید نظریے کو ٹھیک سے سمجھنے اور ماننے والے بچے کو عتیق صاحب کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑتے۔ وہ سوچ سمجھ کر اس پر پابندیاں عاید کرتے ہیں اور ان پابندیوں کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کی مشق کراتے ہیں۔ وہ پہلے بچے کی شرارت کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' اس کے بعد نہایت محبت اور اطمینان کے ساتھ شرارت کے اثرات اور نتائج کو سمجھا کر کردار کی اصلاح کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے' بچے کو داخلی ڈسپلن

سکھانے کی۔ داخلی ڈسپلن (Internal Discipline) یا خود آموز ڈسپلن (Self Discipline) کے ذریعہ بچہ خود کو پہچانتا ہے۔ خود اپنا احترام کرنا سیکھتا ہے اور دوسروں کے لیے مددگار اور کار آمد بننے کی کوشش کرتا ہے یعنی وہ خود اچھا سماجی انسان بننے کی کوشش کرتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بچے کی کوئی شرارت بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ہر صورت حال میں بچے کے پوشیدہ مقصد کو سمجھ کر اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔ کوشش کی جائے کہ کسی بھی صورت حال میں بچے کی ہمت شکنی نہ ہو۔ ہمت افزائی، محبت اور ہمدردی کی وجہ سے اندرونی ڈسپلن سکھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جو والدین اور اساتذہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، جن میں درگذر کی صلاحیت نہیں ہوتی، جو صبر سے کام نہیں کر سکتے، جو بچوں کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہیں اور جو خود احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں، بس وہی بچے کی ناپسندیدہ حرکتوں اور شرارتوں کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہی فوری طور پر خفا ہو کر یا جسمانی سزا دے کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچے کے کردار کی اصلاح ہو گئی۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ جسمانی سزا، خفگی اور بے رخی برتنے سے بچے کی شخصیت میں دُہرا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ چھُپ چھُپ کر ناپسندیدہ اور غیر سماجی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

دراصل لفظ ڈسپلن اطالوی زبان سے لیا گیا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں تعلیم و تربیت۔ اس لفظ کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے جیسے معلّمی، ڈاکٹری، انجینیری اور وکالت کی تعلیم وغیرہ۔ ان پیشوں کی تعلیم کے دوران ہر ایک طالب علم کو اپنے مضمون یا ڈسپلن کے ضابطوں کی پورے طور سے پابندی کرنا ہوتی ہے۔ ہر ایک طالب علم کو باقاعدہ متعلقہ نصاب تعلیم کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ گویا کہ طالب علم کو اپنی دلچسپی، صلاحیت اور علمی قابلیت کے مطابق مضامین (ڈسپلن) کا انتخاب کرنے کی آزادی ہوتی ہے لیکن نصاب کو پورا کرنے سے متعلق جو پابندیاں اور شرائط ہوتی ہیں ان کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں مقررہ معیار کے مطابق پورا کرنے کے بعد ہی طالب علم اس قابل بنتا ہے کہ وہ استاد، ڈاکٹر، انجینیر یا وکیل کی حیثیت سے اپنے پیشہ میں داخل ہو کر کامیابی حاصل کرے اور زندگی کو خوش اسلوبی اور اطمینان سے گزار سکے۔

جدید نظریے کے مطابق ڈسپلن کا مفہوم :

۱۔ ڈسپلن نام ہے ان مضامین کا جو کسی پیشے کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں اور جن کا مطالعہ مقررہ پابندیوں کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ ڈسپلن نام ہے اس کردار سازی کا جو محبت اور صبر کے ساتھ کی جاتی ہے اور جس کا مقصد فرد اور جماعت دونوں کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

۳۔ ڈسپلن نام ہے اس رہنمائی اور مدد کا جس کا دارومدار بچے کی اندرونی صلاحیتوں اور دلچسپیوں پر ہوتا ہے نہ کہ خارجی دباؤ اور خوف پر۔

۴۔ ڈسپلن نام ہے اس عمل کا جس کے ذریعہ بچے کو نہ صرف اپنے جذبات اور امنگوں پر قابو پانا سکھایا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے گردوپیش کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

ڈسپلن--داخلی اور خارجی

ہم سب جانتے ہیں کہ بچہ اپنی پیدائش کے بعد پہلے سال میں کتنا بے بس اور دوسروں کے سہارے کا کتنا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور قوتوں کی بنا پر دھیرے دھیرے ماحول کے مطابق زندگی بسر کرنے کا تھوڑا بہت سلیقہ سیکھ لیتا ہے۔ تین برس کا ہونے کے بعد سے اسے انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے پیش نظر باضابطہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ مہذب اور اچھا انسان بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انسانیت کی تعلیم کے لیے ڈسپلن کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ماں باپ اور استاد کا فرض ہے کہ وہ جمہوری طرز زندگی کے تقاضوں اور شخصیت کی مناسب نشوونما کے لیے گھر اور اسکول کے ماحول کو مثالی اور سازگار بنائیں۔ وہ فیصلہ کریں کہ کس قسم کا ڈسپلن--داخلی یا خارجی مفید ثابت ہوگا۔ داخلی ڈسپلن کی تربیت کے لیے والدین اور اساتذہ کو مسلسل صبر و تحمل اور محبت سے کام لینا ہوتا ہے لیکن خارجی ڈسپلن کے لیے عام طور سے غصہ کا استعمال جائز سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات روزانہ کی زندگی میں وقتی طور پر ایسے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر والدین اور اساتذہ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے اس قسم کے رویے سے بچے کی شخصیت کی نشوونما پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ غصہ کے بے جا اظہار سے بچے خود کو دوسروں کے مقابلہ میں کم تر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

ڈسپلن کی تربیت کا کام ایسا نہیں ہے کہ اسے آن کی آن میں پورا کر لیا جائے۔ یہ تو برسوں تک مسلسل کرتے رہنے کا کام ہے۔ اس کام کے لیے بچے کی زندگی کے ابتدائی دس بارہ برسوں میں نہایت سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ بچے کے کردار کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھ کر رہنمائی کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ عام طور سے گھر اور اسکول میں بچے کے کردار کو ان مفروضوں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے :

۱۔ ہر شخص اپنے کاموں میں اپنے کردار کی خوبیاں ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کے کردار کی اچھائیوں اور برائیوں کو پہچان سکتا ہے۔

۳۔ ہر شخص دوسرے کے کردار میں اپنے نظریے اور معیار کے مطابق خوبی تلاش کرتا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ تینوں مفروضے غلط اور ناقابلِ قبول ہیں۔

بچے کے کردار کو پرکھنے اور جاننے کا جدید طریقہ اس کی نفسیات پر مبنی ہے۔ اس طریقے کو ماننے والے بچے کے کردار کو اس کے اپنے مقاصد کی روشنی میں جانچتے اور دیکھتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ بچے کا کوئی رویہ بھی بے مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے ہر مقصد کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک دوسروں کو دکھانے کے لیے یعنی ظاہری اور دوسرا اپنے لیے یعنی داخلی۔ اصل مقصد یہ داخلی مقصد ہی ہوتا ہے۔ اس مقصد کو دوسرے لوگ آسانی سے نہیں سمجھ پاتے۔ بچہ اپنے داخلی مقصد کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ اس مقصد کو دوسرے لوگ اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک وہ خود اسے ظاہر نہ کردے۔ داخلی مقصد کو ظاہر کرنے کے لیے بچہ پہلے اپنے گردوپیش کے ماحول کو پہچانتا ہے۔ اگر ماحول سازگار ہوتا ہے اور اس میں محبت اور ہمدردی کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں اپنائیت اور قبولیت دکھائی دیتی ہے تو وہ اپنا دل کھول کر سب کے سامنے رکھ دیتا ہے، نہیں تو داخلی مقصد کے صرف اتنے حصہ کو ظاہر کرتا ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والے خوش ہو سکیں۔ جہاں بچے کو خارجی دباؤ سے قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یا جہاں اسے ناسازگار ماحول میں رکھا جاتا ہے وہاں اس کے کردار میں بیجا تصنع اور بناوٹ آجاتی ہے۔ بچہ اپنے گردوپیش کے لوگوں کے پیمانوں اور سانچوں کو خوب پہچانتا ہے چنانچہ وہ اپنے داخلی مقصد کا صرف اتنا حصہ ظاہر ہونے دیتا ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والے خوش ہو سکیں اور اس کی فوراً تعریف کر سکیں۔

ہاں تو یہ بات واضح ہوئی کہ مشاہدہ کرنے والے کردار کی جس خوبی کو خوبی کہہ سکتے ہیں وہ دراصل کردار کی خوبی نہیں ہوتی۔ اصل خوبی تو بچے کے دل میں چھپی رہتی ہے۔ ظاہری کردار تو محض دوسروں کو خوش کرنے اور اپنی تعریف سننے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ڈسپلن کا مطلب کردار کی خوبی ہے تو سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ خوبی کا فیصلہ بچے کے نقطۂ نظر کی

روشنی میں کیا جائے یا ان دیکھنے والوں کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی جائے جو بچے کے داخلی مقصد کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں اور ظاہری کردار کو ہی اصل کردار سمجھ لیتے ہیں۔

دو رُخے کردار کو سمجھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے کے کردار پر کس کا کنٹرول رہنا چاہیے۔ کیا ماں باپ یا استاد بچے کے کردار کو اس طرح کنٹرول کریں کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے معیار کے مطابق خوبی پیدا کرا سکیں یا خود بچے کو اپنے کردار پر اتنا قابو رہنا چاہیے کہ وہ اس میں اپنی خودی اور شخصیت کی نشوونما کو دیکھ کر یہ سمجھ سکے کہ اس کا داخلی مقصد حاصل ہو سکے گا۔ جو لوگ خارجی کنٹرول کو پسند کرتے ہیں وہ بچے کو کٹ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ ان کے یہاں حکم، سزا اور انعام کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ شروع ہی سے بچے کو تعمیلِ حکم کی تعلیم دیتے ہیں مثلاً بچے کا دودھ چھڑاتے وقت اس کو طرح طرح سے ڈرایا جاتا ہے اور اپنا فیصلہ منوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وقت کوئی بندۂ خدا یہ بھی نہیں سوچتا کہ ماں کی گود اور ماں کا دودھ یہی دونوں چیزیں تو بچے کی ساری لذت اور مسرت کا سرچشمہ ہوتی ہیں اور ان ہی کو بُری طرح چھین لیا جاتا ہے۔ دودھ چھُڑاتے وقت بچے پر یہ ظلم تو نہ ڈھایا جائے کہ ماں ادھر ادھر چھپ چھپا کر اسے اپنی محبت اور اپنی گود کی روح پرور حرارت سے بھی محروم کر دے۔ خارجی دباؤ اور کنٹرول والے بچے کو شروع ہی سے لکیر کا فقیر اور دوسروں کا محتاج بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ بچے کے ظاہری کردار کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ اچھا ہے یا برا۔ ان کے یہاں صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حکم کی تعمیل میں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی۔ ان کی نظر میں اچھا بچہ وہ ہوتا ہے جو بڑوں کی نظروں کو پہچانے، ان کے اشاروں پر کٹ پتلی کی طرح ناچتا رہے اور ان کی ہر امید اور خواہش کو بے چون وچرا پورا کرتا رہے۔ ان کے نزدیک کردار کی خوبی یعنی ڈسپلن یہ ہے کہ بچہ اپنے وجود، اپنے تشخص، اپنی عزت اور اپنی خودی کو اپنے ہاتھوں اس طرح خاک میں ملا دے کہ اسے پھر زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنے اس زیاں کا احساس نہ ہو۔ دراصل جب کوئی بچہ اپنے داخلی مقاصد اور جذبات کو زیادہ دیر تک چھُپانے سے تنگ آجاتا ہے تو وہ غصے اور لڑائی کی صورت میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرتا ہے اور اس قسم کے جذبات کے اظہار کے لیے وہ موقع اور محل کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب گھر میں کبھی کوئی مہمان یا اس کے والدین کا کوئی دوست آتا ہے تو وہ اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے رونے دھونے یا لڑنے جھگڑنے لگتا ہے اور والدین یہ

سمجھ کر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ بچہ ان کی تمناؤں اور امیدوں کا خون کر رہا ہے۔

بچے کے کردار کو گھر اور اسکول دونوں جگہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔ گھر میں یہ کنٹرول بلا واسطہ ہوتا ہے اور اسکول میں بالواسطہ۔ اسکول کی نگرانی میں جتنے بھی نصابی اور غیر نصابی مشغلے اور تجربے کرائے جاتے ہیں ان سب کے ذریعے نیز اسکول کے خارجی نظم و نسق کے ذریعے بچے کے کردار کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اسکول اور اسکول کی تمام تر کوششیں اور وسائل وسیلہ سمجھے جاتے ہیں ایک بڑے مقصد یعنی بچے کی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما کا۔ لیکن خارجی کنٹرول میں یقین رکھنے والوں نے ان تمام کوششوں اور وسیلوں کو ہی مقصد بنالیا ہے اور اصل مقصد کو بھول گئے ہیں۔ انھیں صرف وسیلہ یاد رہتا ہے مقصد نہیں۔ جب بچہ پہلے پہل اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہ اسکول کے خارجی ڈسپلن کو دیکھ کر بے حد پریشان اور بددل ہوتا ہے۔ اسے موجودہ روایتی اسکول میں کوئی مشغلہ ایسا نظر نہیں آتا جس کے ذریعے اس کی دلچسپیاں اور ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ نصابِ تعلیم ہو یا استاد سب بچے کو دبانے اور اس پر قابو پانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں بچے کی تمام جبلتوں کا مثلاً کھیلنا کودنا، توڑنا پھوڑنا، بنانا اور مٹانا اور ہنسنا بولنا وغیرہ کا عمر بھر کے لیے خون کر دیا جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت کو دبا دیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ خارجی ڈسپلن (External Discipline) کے ذریعے بچے کو بُری طرح یہ محسوس کرا دیا جاتا ہے کہ وہ کمزور ہے، وہ بے بس ہے اور بے سہارا ہے۔ وہ دوسروں کا ماتحت ہے اور اس کی سماجی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جب یہ بچہ اسکول سے باہر کی دنیا میں قدم رکھتا ہے اور اسکول کے جبریہ کنٹرول کو یاد کرتا ہے تو اس میں انتقامی جذبہ ابھر آتا ہے۔ انتقامی جذبے کے تحت وہ ایسی ایسی نازیبا حرکتیں کرتا ہے کہ نہ صرف والدین بلکہ پورے معاشرے کا ناک میں دم ہو جاتا ہے۔

بچے کے کردار پر بلاواسطہ کنٹرول ہو یا اسکول کے ڈسپلن، قواعد و ضوابط، نصابِ تعلیم اور استادوں کی نگرانی کے ذریعے بالواسطہ ہو یہ دونوں صورتوں میں بچے کی شخصیت کی فطری نشوونما کے لیے مضر ثابت ہوتا، اس کے ذریعے بچے کے کردار میں دُہرا پن آجاتا ہے۔ بچہ دوسروں کی ماتحتی، نگرانی اور کنٹرول میں رہ کر اکثر و بیشتر موقعوں پر ظاہر داری سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے اندر بغیر سوچے سمجھے وہی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نگرانوں اور سرپرستوں کو پسند ہوتی ہیں۔ اس طرح حکم، خوف، لالچ اور دباؤ کے ذریعے پیدا

کردہ کرداری خوبیاں صرف دیکھنے والوں کی نظر میں خوبیاں ہوتی ہیں لیکن وہ خوبیاں بچے کی اپنی خوبیاں نہیں ہوتیں۔ وہ اس کی سیرت کا جزو نہیں بن سکتیں۔ خارجی دباؤ اور کنٹرول کے ذریعے حاصل شدہ علم اور اخلاق دونوں ایک علامت کہے جاسکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے متعلم، اس کے ساتھیوں اور رفقاکار کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ خارجی دباؤ اور کنٹرول کا پروردہ بچہ اپنی نجی اور سماجی زندگی میں ناخوش اور غیر مطمئن رہتا ہے۔ اس کے دل میں حسد اور کینہ بھرا رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی چغلیاں کھا کر اپنا دل خوش کرتا ہے۔ اسے دوسروں پر الزامات لگانے میں سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے عیب چھپانے کے لیے دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرتا رہتا ہے۔ اسے اپنے سوا کسی اور کی تعریف سن کر خوشی نہیں ہوتی۔

جدید نظریے، یعنی داخلی کنٹرول کے حامی بچے کو مکمل آزادی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں آزادی کے ساتھ محبت، توجہ، قبولیت اور ہمت افزائی کا اظہار خوب کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے کو اپنے کردار کو خود ہی کنٹرول کرنا چاہیے۔ وہ شروع ہی سے بچے کی شخصیت کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بچے کو اپنا کھلونا یا کوئی بے جان اور ناسمجھ چیز سمجھ کر اس کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر بچہ اپنے دل میں کوئی مقصد اور کوئی منزل ضرور چھپائے رکھتا ہے اور اپنے گردوپیش کی دنیا کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی مرضی اور سمجھ بوجھ کے مطابق کام کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ بچے کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہر کام کے نتیجے کو دیکھے اور اسے برداشت کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچہ اپنی ننھی سی اور چھوٹی سی دنیا میں اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق آزاد اور خود مختار شہری کی حیثیت سے خوش رہ سکے۔ ان کے یہاں بچے کی بالواسطہ نگرانی کی جاتی ہے اور جب کبھی وہ اپنی مرضی اور توقعات کو پورا کرانا چاہتے ہیں تو بڑی ہوشیاری اور حسنِ تدبیر سے کام کرتے ہیں۔ وہ بچے کے داخلی مقاصد، جذبات اور ارمانوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنے دیتے۔ ان کی کوشش رہتی ہے کہ بچہ اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے آزادی کے ساتھ اپنی شخصیت کی نشوونما اور سیرت کی تعمیر میں لگا رہے۔

کردار سازی کے لیے بچے کی فطرت کو جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہر تندرست بچے میں فطری طور پر قوتِ نمو اور سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر بچہ اپنے دل میں نہ جانے کتنے مقاصد چھپائے رکھتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کے مقاصد کو بہت کم جان پاتے ہیں۔ ہر سمجھ دار

بچہ نہایت غور و فکر کے بعد مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ ان کو جانچتا اور پرکھتا ہے غرضیکہ وہ اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں اپنا کردار بناتا ہے اور اس طرح وہ داخلی ڈسپلن Internal Discipline کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ آج کے تجربے سے کل کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔ وہ اپنے ذاتی تجربوں سے مشکلات کو سمجھنا اور ان پر قابو پانا سیکھتا ہے۔ زندگی کے تجربات اس کے اندر اولوالعزمی، خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا کراتے ہیں۔

خارجی اور داخلی ڈسپلن کا فرق

خارجی ڈسپلن اور خارجی کنٹرول کے حامی کہتے ہیں کہ بچے کو بالکل آزاد اور بے مہار چھوڑنے سے وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی نگرانی کرنا اور اس پر کنٹرول رکھنا ضروری ہے۔ وہ بچے کے لیے اس کی عمر کے مطابق ہر کام کی مقدار اور معیار مقرر کر دیتے ہیں اور اس سے اسی معیار اور مقدار کے مطابق کام کرانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچہ جو کام کرے اپنے نگراں اور سرپرست کی اجازت سے کرے اور اس کے ہر کام کے نتیجے کو مقررہ معیار کے مطابق جانچا جائے۔ وہ بڑے یقین اور اصرار سے کہتے ہیں کہ بچے کی جو عادتیں بچپن میں بن جاتی ہیں وہ عمر بھر اس کا ساتھ دیتی ہیں اس لیے اس کے نگرانوں اور سرپرستوں کو وہی عادتیں اور وہی اخلاقی اقدار سکھانا چاہییں جو بزرگوں کی نظر میں مفید اور کار آمد ہوتی ہیں۔ وہ بچے کی تربیت میں اس کے حال کو مستقبل پر قربان کر کے خوش ہوتے ہیں اور اس قربانی کی وجہ سے اس کی خداداد صلاحیتوں، قوتوں اور دلچسپیوں کا بری طرح خون ہو جاتا ہے۔

داخلی ڈسپلن اور کنٹرول کے حامی بچے کی آزادی کو اس کا پیدائشی حق مانتے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت حال میں اسے اس کے پیدائشی حق سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بچہ اپنی زندگی کا سفر منزل کو جانے بغیر نہایت معصومیت اور سادگی کی حالت میں شروع کرتا ہے اور اس کے ڈسپلن کا مسئلہ پیدائش کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً دودھ پلانے کا مسئلہ، وقت پر سُلانے کا مسئلہ، پیشاب پاخانے کے اوقات کا مسئلہ وغیرہ۔ چنانچہ ان مسائل کو نہایت ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ حل کراتے ہیں۔ وہ بچے کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ مناسب رہنمائی، معقول محبت، بروقت توجہ اور مسلسل قبولیت کے ذریعے کھانے پینے، اٹھنے

بیٹھنے، صحت و صفائی اور دیگر سماجی عادتوں کو آزاد ماحول میں آزادی کے ساتھ سمجھ بوجھ سے کام لے کر پیدا کراتے ہیں اور بچے کو شروع سے تجربے کرنے اور تجربے کے لازمی نتیجے کو بھگتنے کا سبق پڑھاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بچہ نقل کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر، سن کر اور سونگھ کر سیکھتا ہے چنانچہ ہدایت کی جاتی ہے کہ گھر کے ماحول اور زندگی کو بچے کے لیے ہر اعتبار سے مثالی بنایا جائے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچے کی اکثر حرکتیں اضطراری ہوتی ہیں اور اس کو اخلاقی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ وہ جھوٹ اور سچ، ایمانداری اور بے ایمانی اور تعاون اور عدم تعاون وغیرہ الفاظ کو بالکل بے معنی سمجھتا ہے۔ اسے تو عام طور سے محبت، ہمدردی، توجہ اور قبولیت کی خبر رہتی ہے اور ان الفاظ کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ اس وقت بھی خوب خوش ہوتا ہے جب کسی موقع پر اس کی ہمت افزائی کی جاتی ہے چنانچہ سمجھ دار اور داخلی ڈسپلن کی افادیت کو جاننے والے والدین اپنی زندگی کو مجموعی اعتبار سے مثالی بناتے ہیں اور بچوں کو ہلکے پھلکے کام دے کر ان میں خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کراتے ہیں مثلاً وہ شروع ہی سے بچے کو خود سے کھانا کھانے، اپنا منہ ہاتھ دھونے، اپنے کھلونوں کو مقررہ جگہ پر رکھ کر ان کی حفاظت کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے اور چھوٹے موٹے کاموں کے ذریعے بچے کے کردار کی خوبیاں پیدا کرانے کے لیے بلاواسطہ کوشش کرتے ہیں اور بچے کو رفتہ رفتہ اس کی عمر اور صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس طرح وہ عملی کاموں کے ذریعے بچے کی نہ صرف قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل کو تیز کرتے ہیں بلکہ اس کی قوتِ تخلیق کی بھی آبیاری کرتے ہیں۔ وہ بچے کو دوسروں کے ساتھ رکھ کر ملنے جلنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ اس طرح بچے کی فطرت کے مطابق اس کی اپنے کردار پر خود کنٹرول کرنے اور داخلی ڈسپلن کی تربیت کی جاتی ہے۔

داخلی ڈسپلن کے حامی عملی کاموں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ان کاموں کے ذریعے جو بچے کی دلچسپی اور ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں، بچے میں جسم کے مختلف اعضا کا مناسب استعمال سکھانے کے علاوہ صفائی، ستھرائی، اشتراک عمل، محنت، محبت، ایمانداری اور مستقل مزاجی جیسی خوبیاں پیدا کراتے ہیں۔ ان کا زیادہ زور تجربے اور تجربے کے نتائج کو بھگتنے پر ہوتا ہے۔ وہ بچے کو شروع سے ہی یہ سکھاتے ہیں کہ جو کام کیا جائے اسے اچھی طرح کیا جائے اور جو فیصلہ کیا جائے، سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جو کام کیا جائے اسے پوری

محنت اور لگن سے کیا جائے اس لیے کہ مدت اور شدت کا حاصل ضرب ہی کامیابی ہوتا ہے۔

داخلی ڈسپلن کو ماننے والے بچے کو لکیر کا فقیر بنانے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں احکامات کی آنکھ بند کر کے تعمیل کرنے اور دوسروں کے مشوروں کو بغیر سوچے سمجھے مان لینے سے شخصیت کی صحیح نشوونما نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ آزاد اور سازگار ماحول کا تربیت یافتہ بچہ مستقل مزاج، آزاد خیال، خود بیں، خود کفیل، بلند ہمت، غم گسار، ہمدرد اور مددگار ہوتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی ہوتی ہے اور عزتِ نفس۔ وہ ہر صورت حال میں اپنے وجود اور تشخص کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے زندگی بسر کرنے کا فن معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور دوسروں کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ عزت اور افتخار جانتا ہے۔

ڈسپلن برائے جمہوری طرزِ زندگی

برطانوی اقتدار پچاس برس پہلے ختم ہو چکا ہے لیکن اس کے اثرات ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ابھی تک جاری و ساری ہیں۔ اسکولوں بالخصوص ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اکثر و بیشتر استاد حاکمانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے اسکولوں میں قبرستان جیسا خاموش ماحول بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکول کے اوقات میں جماعتوں کے کمروں کے اندر اور باہر جو خاموشی رہتی ہے وہ اسے دیکھ کر اپنی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اچھے ڈسپلن کا مطلب صرف یہ ہے کہ بچہ استاد کی موجودگی اور نگرانی میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہے اور استاد کے حکم کی تعمیل کرے۔ وہ ڈسپلن کے جدید نظریے کے مخالف تو نہیں ہیں لیکن اسے اپنے یہاں موجودہ حالات میں قابلِ عمل نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں عام طور سے جو بچے آتے ہیں وہ اپنے والدین کی پسماندگی، جہالت، لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُنھیں اپنے وجود اور عزت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو انعام کے لالچ اور سزا کے خوف سے کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وہی قدیم طریقۂ تعلیم اختیار کرنا پڑتا ہے جس کے اثرات کو دیکھ کر کسی دانشور نے صدیوں پہلے یہ کہا تھا کہ "ماں باپ کی محبت کے مقابلہ میں استاد کی مار اچھی ہوتی ہے۔"

ہم رومن کیتھلک پادریوں کے قائم کردہ کون وینٹ (Convent) اسکولوں کو دیکھتے ہیں تو وہاں کے طریقۂ تعلیم اور ڈسپلن کے طریقہ میں بھی وہی قدامت پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سزا کے خوف سے تمام لڑکے اور لڑکیاں گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ کوئی سوال دریافت کر سکے یا استاد کی پڑھائی ہوئی معلومات پر کوئی اعتراض کر سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ استادوں کی تربیت پولیس افسروں کی تربیت

گاہوں میں ہوتی ہے۔ ان اسکولوں کی تعلیم پر مسز پورنم سکسینہ کا ایک مضمون ۳۰ / اپریل ۱۹۹۶ء کے ہندستان ٹائمز میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اپنے تاثرات کو باوزن بنانے کے لیے چند اُن ماؤں کے تاثرات کا بھی حوالہ دیا ہے جو کون وینٹ اسکولوں میں پڑھ چکی ہیں اور اب اپنے بچوں کو کون وینٹ کے بجائے دوسرے پبلک اسکولوں میں پڑھانا بہتر سمجھتی ہیں۔ لکھا ہے کہ کون وینٹ اسکولوں میں ہندستانی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب سکھائی جاتی ہے۔ مواد تعلیم کو توتوں کی طرح رٹا کر بچے کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی جاتی ہے۔ تعلیم کا زندگی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ طلبہ مجبور ہوتے ہیں استادوں کے مقررہ اصولوں کو بے سوچے سمجھے ماننے اور ان پر عمل کرنے پر۔ کون وینٹ کے طلبہ اور طالبات میں عام طور سے خود غرضی اور خود نمائی کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی اچھائیوں اور برائیوں سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے کے ماہر اور ہوائی قلعے بنانے کے استاد ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد انسانیت کے شرف و وقار کو بڑھانا نہیں بلکہ افادیت اور عیش کوشی بن جاتا ہے۔ انھیں جمہوری طرزِ زندگی کا سبق نہیں پڑھا جاتا۔

مسز پورنم سکسینہ نے ایسے پبلک اسکولوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں شروع ہی سے بچوں کو جمہوری طرز زندگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مختلف قسم کے نصابی کاموں اور معاون نصابی سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا جاتا ہے۔ جہاں طلبہ کو دوسروں کی خوشی اور غم میں شریک رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں طلبہ کو خود کفیل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جہاں بچوں سے ماں جیسی محبت کی جاتی ہے اور انھیں استادوں پر بھروسہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں سختی کے بجائے نرمی سے اور حکم کے بجائے باہمی مشورہ سے کام کیا جاتا ہے اور استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے قریب رہ کر اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔

ہم نے مسز پورنم سکسینہ کا مضمون پڑھنے کے بعد مشرقی گریٹر ایسٹ آف کیلاش کے دہلی پبلک اسکول کو دیکھا۔ اسکول کی پرنسپل صاحبہ کی اجازت سے پانچویں جماعت تک پڑھانے والی استانیوں سے ملاقات کی۔ چوتھی جماعت کی کلاس ٹیچر مسز جے شرما کے طریقۂ تعلیم کو دیکھا۔ اسکول کے اوقات ختم ہونے کے بعد اسٹاف روم میں بیٹھ کر ان سے جو گفتگو ہوئی اس میں مسز شرما نے بتایا کہ اسکول میں تمام داخلے بچوں کی ذہنی اور تہذیبی جانچ کے بعد ہوتے ہیں۔ سب طلبہ ذہنی اور تہذیبی اعتبار سے تقریباً یکساں ہوتے ہیں اور استاد شاگرد کے

درمیان دوستانہ رشتہ رہتا ہے چنانچہ تعلیم و تربیت کے کام میں زیادہ مسئلے نہیں پیدا ہوتے۔

مسٹر شرما نے اپنی جماعت کے بچوں اور دوسری جماعتوں کے بچوں کی دلچسپیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کی دلچسپیوں کے مطابق کاموں کے ذریعے کس طرح ان میں جذبات پر قابو پانے، دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے، دوسروں کی چیزوں کی حفاظت کرنے اور دوسروں کی عزت کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے چند تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں مثلاً بچوں کی حکومت، اسکاؤٹنگ، ڈراما، پکنک، تاریخی سیر، ڈرائنگ، پینٹنگ، موسیقی، مختلف قسم کے کھیلوں اور ادبی مقابلوں کی تعلیمی اور سماجی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان تمام سرگرمیوں میں بچے نہ صرف حصہ لیتے ہیں بلکہ ان کی تنظیم کی بیشتر ذمہ داریاں بھی وہی پوری کرتے ہیں۔ استاد محض ایک تجربہ کار رہنما کی حیثیت سے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔

ڈسپلن سے متعلق سوال کرنے پر مسز شرما نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا کہ "ہم ڈسپلن کو تعلیم کی آبرو مانتے ہیں۔ ڈسپلن سے استاد اور شاگرد دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ جہاں ڈسپلن نہ ہوگا وہاں تعلیم نہ ہوگی"۔ انھوں نے بتایا کہ جب کبھی ڈسپلن سے متعلق کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو متعلقہ استانی مسئلہ خیز بچے کو پرنسپل صاحبہ کے پاس بھیجنے کی بجائے اپنے قریب لاتی ہے اور پیار محبت کے ساتھ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہنے لگیں کہ جب کبھی میری جماعت میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو میں سب سے پہلے اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لیتی ہوں۔ اپنے سبق کی تیاری کو دیکھتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کہ سبق کے اہم نکات کی کس طرح وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد بچے کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں یہ جاننے کی کہ سبق میں بچے کی دلچسپی کیوں ختم ہوئی۔ بچے کی جسمانی اور جذباتی صحت کیسی ہے۔ وہ گھر سے خوش ہو کر آیا ہے یا ناخوش ہو کر وغیرہ۔ اس طرح صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد باہمی گفتگو کے ذریعے مسئلہ کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اسکول کے گائڈنس کونسلر کا تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ کسی بھی صورتِ حال میں مسئلہ خیز بچے کو جسمانی سزا نہیں دینی چاہیے اور نہ ہی اسے ڈانٹنا ڈپٹنا چاہیے۔ محبت اور صبر و تحمل کے ساتھ بات کرنے سے بچہ اپنی غلطی یا کمزوری کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ آزادی سے متعلق سوال کرنے پر مسز شرما نے بے ساختہ یہ کہا کہ بچے کو بالکل آزاد چھوڑنا اتنا ہی برا ہے جتنا اسے سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے قابو میں رکھنا۔ ان

کا خیال ہے کہ آزادی بچہ کا پیدائشی حق ہے لیکن اس حق کے استعمال کا جائز طریقہ سکھانا ماں باپ اور استاد کا اولین فرض ہے۔ بچے کو خودرو پودے کی طرح چھوڑ دینے سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ مناسب نگرانی اور رہنمائی کے بغیر بچہ نہ تو لکھنا پڑھنا اور گننا ہی ٹھیک سے سیکھ پاتا ہے اور نہ ہی وہ سماجی اعتبار سے اچھا انسان بنتا ہے۔ اسے کسی کام کو باقاعدگی سے کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ وہ تو بس من موجی بن کر زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔

اپنے یہاں گھروں میں تو بچوں کو عام طور سے بے مہار چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن کوئی ادارہ ہم نے ایسا نہیں دیکھا جہاں بچوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہو۔ ہمارے یہاں ایک طرف سرکاری اور نیم سرکاری اسکول ہیں اور دوسری طرف پبلک اسکول سرکاری اسکولوں کے استادوں کا رویہ حاکمانہ رہتا ہے اور پبلک اسکولوں کے استادوں کا رویہ عام طور سے دوستانہ ہوتا ہے۔ حاکمانہ رویے سے خارجی ڈسپلن قائم کیا جاتا ہے اور دوستانہ رویے سے داخلی ڈسپلن۔ خارجی ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے استاد بچوں کے ساتھ بالکل حاکم بن کر رہتا ہے۔ وہ بچوں سے منہ چڑھا کر اور چلا کر بات کرتا ہے۔ بچوں کا تعاون زبردستی حاصل کرتا ہے۔ تمام معاملات میں اپنی رائے کو اہمیت دیتا ہے۔ غلطیوں کی طرف توجہ دلا کر بچوں کی ہمت شکنی کرتا ہے۔ انھیں کسی قسم کی ذمہ داری دینا پسند نہیں کرتا۔ ان کی دلچسپیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ موقع بموقع جسمانی سزا کا بھی خوب استعمال کرتا ہے۔ اس طرح خارجی ڈسپلن کی وجہ سے بچوں کو خود کو پہچاننے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان میں خودداری اور عزت نفس کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسکول کے غیر دلچسپ ماحول سے بددل ہو کر اکثر بچے قبل از وقت پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتے ہیں اور جو بچے اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں وہ بھی محض کتابیں پڑھ کر امتحانات میں کامیابی یا ناکامی حاصل کرتے ہیں۔ انھیں تعلیم سے اپنی شخصیت کی صحیح نشوونما میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ بالآخر انھیں جمہوری طرزِ زندگی کو اپنانے میں نہ صرف پریشانی بلکہ ناکامی ہوتی ہے۔

جن اسکولوں میں استاد کا رویہ دوستانہ ہوتا ہے اور داخلی ڈسپلن کو ترجیح دی جاتی ہے وہاں بچوں کو آزادی کے ساتھ ذمہ داری بھی دی جاتی ہے اور ان کی صحیح طور سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان باہمی محبت اور عزت کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ بچوں کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر ممکن طریقے سے ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ مختلف کاموں

کے ذریعے بچوں میں فرائض کو ادا کرنے اور ذمے داریوں کو پورا کرنے کا شوق پیدا کرایا جاتا ہے۔ بحث و مباحثہ کے ذریعے بچوں کو اپنے خیالات کو صحیح طریقے سے ظاہر کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ بچوں کو شروع ہی سے خود بیں اور ذمہ دار شہری بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ :

۱۔ سبق کی تیاری سوچ سمجھ کر کی جائے۔ اور کوئی سبق بغیر تیاری کے نہ پڑھایا جائے۔

۲۔ ہر صورتِ حال میں سلامت روی اختیار کی جائے اور خفگی کا اظہار بے جا طریقے سے نہ کیا جائے۔

۳۔ استاد کے قول و فعل میں سچائی، خلوص اور محبت ہو۔

۴۔ طلبہ کے جذبات اور خیالات کا احترام کیا جائے۔

۵۔ کسی طالب علم کی ہمت شکنی نہ کی جائے۔

۶۔ کسی طالب علم کی تعریف اس طرح نہ کی جائے کہ دوسرے طلبہ میں حسد کا مادّہ یا احساسِ کمتری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

۷۔ مختلف کاموں کے لیے طلبہ کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان میں ایک دوسرے سے سیکھنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا شوق پیدا ہو۔

۸۔ باہمی مشوروں کے ذریعے جو فیصلے کیے جائیں ان کو مانا جائے۔

۹۔ طالب علم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے پہلے اس کی اچھائیوں کی تعریف کی جائے اور پھر برائیوں کو دور کرنے کا طریقہ سمجھایا جائے۔

۱۰۔ جماعت کے ہر ایک طالب علم کو باری باری سے جماعت مانیٹر بننے کا موقع دیا جائے۔

شخصیت کی نشوونما

ہمارے یہاں بچے کی شخصیت کی صحیح نشوونما کے لیے گھر اور اسکول میں کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی۔ اگر کسی بچے کو ماں باپ اور استاد کی تھوڑی بہت توجہ ملتی بھی ہے تو اس طرح کہ اس کی خداداد صلاحیتیں ختم ہو جائیں۔ وہ دوسروں کا محتاج بن جائے اور اس کے ذہن میں ایسی گتھیاں پڑ جائیں کہ عمر بھر سلجھائے نہ سلجھ سکیں۔

گزشتہ چند برسوں میں بچے کی جسمانی نشوونما، ذہنی ترقی، نفسی حالت اور سماجی رجحان سے متعلق بہت کچھ چھان بین ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بچے کی نشوونما کے لیے قدرت اپنا کام خوب ٹھوک بجا کر کرتی ہے لیکن ماں باپ، استاد رشتہ دار اور گردوپیش کی دنیا اپنا کام ٹھیک سے نہیں کر پاتی۔ چنانچہ بچہ شروع ہی سے غیر طبعی بننے لگتا ہے۔ ماں باپ اور دیگر عزیز و اقارب لاڈ پیار میں آکر بچے کو اپنا کھلونا بنا لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بچے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی امیدوں کو پورا کرانے کے لیے بچے کو بے جا طریقوں سے اکساتے اور دباتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہر بچہ اپنے لیے کوئی مقصد، کوئی منزل ضرور مقرر کر لیتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے مسلسل کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے ڈانٹتے ڈپٹتے اور مارتے پیٹتے وقت اس حقیقت کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ محبت، صبر و تحمل، سوجھ بوجھ اور تھوڑے علم کے استعمال سے بچہ خدا کا خلیفہ بن کر انسانیت کو فروغ دینے کے قابل بن سکتا ہے۔

جسمانی نشوونما کے عمل میں قدرت کے حصہ کو سمجھانے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں "پہلے سال بچہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہے مگر دو سال سے پانچ سال کی عمر تک اس کی بڑھوتری کی رفتار قدرتاً سست پڑ جاتی ہے۔ پہلے سال کے کھچاؤ کے بعد یہ بھراؤ کا زمانہ ہوتا ہے جس کے بعد سات سے گیارہ برس تک پھر بھراؤ کے لیے رکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر کھچاؤ ہوتا ہے اور اس سے متصل ایک بھراؤ کا دور اور آتا ہے جو اسے ترشاتر شایا ولولہ اور امنگوں

والا نوجوان بنا دیتا ہے (تعلیمی خطبات ص ۱۰۳)

ایک دوسرے مفکرِ تعلیم اور ماہر نفسیات پروفیسر J.D. Walders نے نشوونما کے فطری عمل کو سمجھانے کے لیے عمر کے پہلے چوبیس برسوں کو چھ چھ برس کے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شروع کے چھ برس جسمانی نشوونما کے لیے ہوتے ہیں' کہتا ہے کہ پہلے چھ برسوں میں بچے کا قد تیزی سے بڑھتا ہے۔ پہلے سال میں وہ بالکل بے بس اور دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے دوسرے سال کے شروع ہی میں کھڑا ہونے لگتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ چلنا اور بولنا سیکھ لیتا ہے۔ چھ برس کا ہونے پر دودھ کے دانت ٹوٹنے اور مستقل دانت نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ اب وہ حرکی مہارتوں اور حواسِ خمسہ کی مدد سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ پروفیسر Walders کا خیال ہے کہ چھ سے بارہ برس کی عمر میں بچہ ذرا زیادہ جذباتی ہوتا ہے۔ اس عمر میں صرف جذبات پر قابو پانے اور ان میں پاکیزگی پیدا کرنے کے کوشش کرنا چاہیے اس کے بعد بارہ سے اٹھارہ برس کی عمر میں قوتِ ارادی کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد ذہنی پختگی کا دور شروع ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر ہر شخص بچہ ہو یا بڑا سماجی ہوتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے قبولیت حاصل ہو۔ اسے پسند کیا جائے۔ اسے سماج میں کوئی مرتبہ یا مقام حاصل ہو۔ اس کی اپنے ساتھیوں میں پوچھ ہو۔ ہر شخص میں کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں اور کچھ کمزوریاں بھی۔ اچھائیوں کے اعتراف سے ہمت افزائی ہوتی ہے اور وہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ کمزوریوں کو دیکھ کر برا بھلا کہنے یا تنقید کرنے سے بچے کی ہمت شکنی ہوتی ہے اور اس کی طبیعت کا رجحان غیر سماجی کاموں کی طرف ہونے لگتا ہے۔ عام طور سے کردار کے بننے اور بگڑنے میں ماں باپ اور استاد کے برتاؤ اور سلوک کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

بچے کی قوتِ مشاہدہ جتنی تیز ہوتی ہے اتنی تیز اس کی قوتِ گویائی نہیں ہوتی۔ بچہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی مشاہدات کے ذریعہ اپنے گردوپیش کی دنیا کو جاننا اور سمجھنا شروع کر دیتا ہے لیکن اپنے علم اور تاثرات کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بہت دنوں تک ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہ کر بولنا سیکھتا ہے اور جیسے جیسے اس کے سماجی رشتوں میں اضافہ ہوتا ہے اس کی قوتِ گویائی اور ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کر کے اپنے کردار کے لیے رہنمائی حاصل

کرتا ہے۔ عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ہر تندرست بچہ اپنے داخلی اور خارجی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا فن سیکھتا ہے۔ اس کی ذہنی اور جذباتی نشوونما پر اس بات کا بہت اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کس طرح اور کس حد تک مطابقت پیدا کرتا ہے۔ خوش گوار اور ہمت افزا ماحول میں پرورش پانے والے بچے کو اپنے داخلی اور خارجی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی اور اس کی ذہنی نشوونما کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ناخوش گوار اور نامساعد ماحول کا پروردہ بچہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے کمزور اور سماجی اعتبار سے غیر طبعی بنتا ہے۔

شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما کے لیے زندگی کے پہلے چھ برس بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی عمر میں اچھی یا بری عادتیں بننا شروع ہوتی ہیں۔ اسی لیے نرسری اسکولوں کی اہمیت اور ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ بچے کو سازگار ماحول اور تربیت یافتہ استادوں اور استانیوں کی رہنمائی اور نگرانی میں اچھی عادتیں اور پسندیدہ کردار بنانے میں مدد مل سکے۔ اس کے بعد چھ سے بارہ برس کی عمر میں یعنی ابتدائی تعلیم کے دوران صحیح اور سنجیدہ کوشش سے پسندیدہ عادتوں میں پختگی پیدا کرانے اور ناپسندیدہ عادتوں اور کردار کو بدلنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے بعد عادتوں اور کردار کے بنانے اور بدلنے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔

اب ابتدائی تعلیم کے اسکولوں میں داخلے کے وقت قدرِ ذہانت کی جانچ کا چلن شروع ہو گیا ہے۔ جانچ کے نتیجہ کو طالب علم کے فائل میں درج کر دیا جاتا ہے اور پھر ماہانہ اور سالانہ رپورٹوں میں اس کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح طالب علم کو شروع سے ہی یہ محسوس کرا دیا جاتا ہے کہ وہ کتنا ذہین یا کتنا غبی ہے۔ وہ ذہنی اعتبار سے تیز ہے یا سست۔ قدرِ ذہانت کی جانچ کے نتیجہ کی بنیاد پر استاد شروع ہی سے طالب علم میں احساس برتری یا احساس کمتری پیدا کرا دیتا ہے۔ یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ قدرِ ذہانت کی جانچ کے طریقے اور نتیجہ کو سو فیصدی صحیح سمجھنا اور اس کی بنیاد پر طالب علم کے دل پر ذہین یا غبی ہونے کی مہر ثبت کر دینا غلط ہے۔ صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم میں خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کرائی جائے۔ اس کی انفرادیت اور شخصیت کا احترام کیا جائے۔ اسے ذمہ داریاں دے کر یہ یقین دلایا جائے کہ وہ استاد کی آنکھ کا تارا اور اس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اس طرح استاد کی محبت اور قبولیت سے طالب علم کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو سمجھنے اور فروغ دینے میں مدد ملتی ہے اور جماعت اور اسکول

کے عام ڈسپلن میں طلبہ کی رائے کا احترام کرنے سے جو ڈسپلن قائم ہوتا ہے وہ داخلی اور خود آموز ڈسپلن کہلاتا ہے اور بالآخر یہی ڈسپلن طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

شخصیت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ استاد کسی بھی صورتِ حال میں بچے سے مایوس نہ ہو۔ اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں جو آتا ہے وہ کچھ مقصد لے کر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ استاد بچے کے مقصد کو نہ پہچان سکے لیکن اسے خود کو تو ضرور پہچان لینا چاہیے اور اپنے اخلاق اور کردار کو بچوں کے لیے مثالی بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بچے کی شخصیت پر ماں باپ اور استاد کے برتاؤ، سلوک اور اخلاق کا بے حد اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے گھر اور اسکول کے ماحول کا بچے کی شخصیت کی نشوونما پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ

۱۔ نکتہ چینی کے ماحول میں رہ کر بچہ سہما اور ناکارہ بنتا ہے۔

۲۔ سزا اور خوف کے ماحول میں رہ کر بچہ لڑاکو بنتا ہے۔

۳۔ ہنسی اور مذاق کے ماحول میں رہ کر بچہ شرمیلا بنتا ہے۔

۴۔ غیر محفوظ ماحول میں رہ کر بچہ ذہنی اعتبار سے پریشان رہتا ہے۔

۵۔ طنزیہ ماحول میں رہ کر بچہ خطاکار اور بے کار بنتا ہے۔

۶۔ رواداری کے ماحول میں بچہ صابر شاکر بنتا ہے۔

۷۔ ہمت افزا ماحول میں رہ کر بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ پیار محبت کے ماحول میں رہ کر بچہ دوسروں سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔

۹۔ پسندیدہ اور سازگار ماحول میں رہ کر بچے میں خود شناسی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۱۰۔ ایمانداری کے ماحول میں رہ کر بچہ ایماندار بنتا ہے۔

۱۱۔ حق اور انصاف کے ماحول میں رہ کر بچہ منصف مزاج بنتا ہے۔

۱۲۔ پرسکون اور اطمینان بخش ماحول میں رہ کر بچہ دوسروں پر بھروسہ کرنا سیکھتا ہے۔

۱۳۔ بے تکلفی اور بھائی چارہ کے ماحول میں رہ کر بچے کی دنیا دلچسپ اور مزیدار بن جاتی ہے۔

شخصیت کی پہچان

اگر ڈسپلن کی تربیت کوئی آسان کام ہوتا تو سمجھ دار والدین اور اساتذہ کے تربیت یافتہ بچوں میں غیر طبعی (Abnormal) بچوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھنے میں نہ آتی۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ بچے کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور اس کی تربیت اور اصلاح کے لیے عام طور سے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان سے اصلاح کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ گھر اور مدرسے کے ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی اور نہ ہی والدین اور اساتذہ اپنے عمل اور حسنِ سلوک سے باہمی محبت، عزتِ نفس اور اشتراکِ عمل کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تو ہم میں سے ہر شخص دوسرے کو ڈسپلن کی تربیت کا کوئی نہ کوئی طریقہ اور اصول ضرور بتا سکتا ہے لیکن کوئی ٹھیک سے یہ نہیں بتا سکتا کہ بچہ شرارت کیوں کرتا ہے اور اس کی شخصیت کو کس طرح پہچانا جاتا ہے۔

یوں تو ڈسپلن اور تربیت دونوں ہم معنی سے لفظ ہیں لیکن ڈسپلن سکھانے کے لیے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈسپلن کے بغیر صحیح تربیت اور شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما مشکل ہے لیکن وہ ڈسپلن نہیں جو حکم اور تشدد یا سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے قائم کیا جاتا ہے بلکہ وہ ڈسپلن جو خود آموز (Self Discipline) ہوتا ہے اور جس کی بنیاد بچے کی نفسیات اور ضرورتوں پر ہوتی ہے۔ وہ ڈسپلن جو بچوں کو آزادی اور ذمہ داری دے کر سکھایا جاتا ہے اور جس کے ذریعہ بچوں میں خود سوچ سمجھ کر آگے بڑھنے کی عادت پیدا کرائی جاتی ہے۔

ڈسپلن کی تربیت کے لیے بچے کی شخصیت کو پہچاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر والدین اور اساتذہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ انعام کے لالچ اور سزا کے خوف سے شخصیت کو حسب منشا سنوارا اور بنایا جا سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ شخصیت کی نشوونما کے لیے اس کو پہچاننے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا پہچاننا خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ ہر بچے

کی شخصیت جداگانہ ہوتی ہے۔ کردار کے تحقیقاتی مطالعوں کے ذریعہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کوئی دو بچے بھی کردار کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن بعض دلچسپیاں، ضرورتیں اور خواہشات سب کی یکساں ہوتی ہیں۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ بچے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود یکساں بھی ہوتے ہیں۔ البتہ دلچسپیوں اور خواہشات کے اظہار کے طریقے یکساں نہیں ہوتے۔ ان طریقوں کے اظہار کی بنا پر کسی کا شمار طبعی (Normal) بچوں میں ہونے لگتا ہے اور کسی کا غیر طبعی بچوں میں۔ غیر طبعی بچہ مسئلہ خیز بھی کہلاتا ہے اور جو بچہ حسب معمول اپنا کام کرتا رہتا ہے وہ طبعی کہلاتا ہے یعنی طبعی بچہ وہ ہوتا ہے :

۱۔ جو اپنے وجود کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرتا یا یہ کہ جو خود کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔

۲۔ جو خود کو کسی سے متعلق اور کسی کا چہیتا سمجھتا ہے۔

۳۔ جو دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کر کے خوش ہوتا ہے۔

۴۔ جو اپنی عمر کے اعتبار سے اپنے مسئلوں کو خود حل کر لیتا ہے اور مشکلات پیش آنے پر گھبراتا نہیں۔

۵۔ جو جماعتی زندگی کو پسند کرتا ہے۔

۶۔ جو ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرتا ہے۔

۷۔ جو غیر سماجی حرکتوں کو ناپسند کرتا ہے۔

۸۔ جو دوسروں کی عزت کرتا ہے اور دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔

۹۔ جو دوسروں کی خوشی اور غم میں شریک رہتا ہے۔

۱۰۔ جو اپنا کام محنت اور خوش اسلوبی سے کرتا رہتا ہے۔

اگر کسی استاد کو اپنی جماعت کے بچوں میں یہ سب خوبیاں نظر نہ آئیں تو مایوس نہیں ہونا چاہئیے۔ اسے اس یقین کے ساتھ اپنا کام کرتے رہنا چاہیے کہ بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور شوق بھی۔ ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو محبت، عزت اور ہمت افزائی کے ذریعہ جاننے اور پہچاننے کی کوشش جاری رکھنا چاہیے۔ اپنے عمل اور حسن سلوک سے باہمی محبت، عزتِ نفس اور اشتراکِ عمل کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔ اس طرح صبر و تحمل اور پیار و محبت کے ساتھ کام کرنے سے غیر طبعی بچے کو بھی طبعی بنانے میں مدد ملے گی اور طبعی بچوں کو اور زیادہ اچھا بننے کا شوق پیدا ہوگا۔

غیر طبعی بچے کو طبعی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی صحیح طریقہ سے ہمت افزائی کی جائے۔ ہمت افزائی کی ذمہ داری نہ صرف والدین اور اساتذہ کی ہوتی ہے بلکہ یہ ذمہ داری ہر اس شخص پر عاید ہوتی ہے جس سے بچے کو کسی نہ کسی صورت میں واسطہ پڑتا ہے مثلاً اسکول کا چوکیدار، چپراسی اور کلرک وغیرہ۔ ہمت افزائی بروں کو اچھا اور ہمت شکنی اچھوں کو برا بنادیتی ہے۔ پسندیدہ کردار کے بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تدریس کو بچے کی دلچسپیوں اور ضرورتوں سے مربوط کیا جائے۔ کوشش کی جائے یہ سمجھنے کی کہ بچہ کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کچھ کر سکنے کے قابل ہے۔ اس کی دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق آگے بڑھنے کا شوق پیدا کرایا جائے۔ انعام کے لالچ میں آگے بڑھانے یا اول نمبر حاصل کرنے پر زور دینے کا طریقہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہمت شکنی بہت بری بلا ہے۔ یہ طبعی بچے کو غیر طبعی بنادیتی ہے اور وہ اپنی جماعت اور سماج میں طرح طرح کی شرارتوں کے ذریعے خود کو نمایاں کرنے لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ سمجھ دار استاد بچے کی شرارتوں کو دیکھ کر اس پر تنقید یا تنبیہ نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تنقید یا تنبیہ سے بچے کو تکلیف ہوتی ہے اور پھر استاد سے ناراض ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی سیکھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تنقید یا تنبیہ کے بجائے نہایت صبر و تحمل اور پیار محبت کے ساتھ بچے کی شرارت کے مقصد کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچوں کی بالخصوص نوبالغ اور بالغ بچوں کی کوئی شرارت بے مقصد نہیں ہوتی۔ چھوٹے بچے تو عام طور سے اکثر شرارتیں محض تفریح طبع کے لیے کرتے ہیں لیکن نوبالغ اور بالغ بچے یا تو توجہ اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے شرارت کرتے ہیں یا وہ انتقام لینے کی غرض سے شرارت کرتے ہیں۔ بعض بچے بالخصوص لڑکیاں خود کو بے بس ظاہر کر کے ڈسپلن کو خراب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

توجہ طلبی :

توجہ اور محبت کا بھوکا بچہ شروع میں مثبت اور تعمیری کاموں کے ذریعہ خود کو منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب اس طرح کے کاموں سے اسے والدین یا اساتذہ کی محبت اور توجہ

حسب منشا نہیں مل پاتی تو وہ مایوس ہو کر منفی اور تخریبی کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور بدنام ہو کر نام پیدا کرنے اور توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا خون کر کے اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔

توجہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بچہ بالکل گربۂ مسکین بن کر استاد کا پسندیدہ شاگرد بن جاتا ہے اور خود کو بالکل بے ضرر اور نیاز مند ثابت کرتا رہتا ہے۔ اسے سدا یہ خواہش رہتی ہے کہ استاد کی ساری توجہ اسے ملتی رہے۔ دیر سویر حسب منشا توجہ نہ مل سکنے پر غیر مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر چھپ چھپ کر شرارتیں کرنے لگتا ہے اور اس طرح نمایشی رویہ اختیار کرنے والا بچہ جماعت کے ڈسپلن کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

جو بچہ اپنی زندگی کا مقصد توجہ حاصل کرنا بنا لیتا ہے وہ خود کو کسی بھی صورتِ حال میں نظر انداز کیا جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ نظر انداز کیے جانے کے مقابلہ میں سزا پانے اور بدنام ہونے کو پسند کرتا ہے۔ شرارتوں کی وجہ سے اسے توجہ اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے بچوں کی اصلاح یا تربیت کے لیے جو استاد خود کو مختلف کاموں میں مصروف رکھتا ہے اور توجہ کے خواہش مند بچے کی طرف فوراً متوجہ نہیں ہوتا یا اس پر خفا ہو کر اسے نصیحت کرتا ہے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دراصل کامیاب وہ استاد ہوتا ہے جو غیر طبعی بچے کی طرف اس وقت زیادہ توجہ نہیں دیتا جب وہ شرارت کرتا ہے لیکن کسی اور موقع پر اس کی طرف خوب متوجہ ہوتا ہے۔ بچے کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی مناسب طریقہ سے ہر وقت ہمت افزائی کی جائے۔ غیر سماجی حرکتوں سے بچانے کے لیے سماجی اور تعمیری کاموں میں دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ اسے محسوس کرایا جائے کہ وہ اپنی جماعت کا مفید اور کارآمد رکن ہے۔ اس قسم کے رویّے سے اسے اپنے وجود کا احساس ہوگا۔ اسے جماعتی کاموں میں دلچسپی پیدا ہوگی اور اس کی توجہ کا مرکز اپنی ذات کے سوا پوری جماعت بنے گی۔

اقتدار :

توجہ سے محروم رہنے کی صورت میں اکثر بچے قوت اور اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے غیر سماجی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ انہیں لیڈر بننے کا خبط ہو جاتا ہے۔ وہ لیڈر بن کر اپنی

جماعت اور اسکول میں حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کا مالک بن کر استاد کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ استاد ان کی راہ میں کسی قسم کی روکاوٹ نہ پیدا کرے۔ اس قسم کے بچے باغی اور شوریدہ سر بن جاتے ہیں۔ انھیں جھوٹ بولنے اور بے جا بحث کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ جماعت اور اسکول کے نظم وضبط کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض مجہول قسم کے بچے اپنا کام پورا نہ کر کے استاد کو پریشان کرنے اور جماعت کے نظم وضبط کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے بچوں کے ساتھ کام کرنے میں ایک ناسمجھ اور ناتجربہ کار استاد اپنی توہین محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنی بے عزتی کا احساس ہوتا ہے اور بالآخر دل برداشتہ ہو کر بچوں کو زبردستی دبانا چاہتا ہے۔ اس طرح غیر طبعی بچوں اور استاد کے درمیان زبردست خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔

اچھا اور سمجھ دار استاد اس قسم کے غیر طبعی بچوں کو سب سے پہلے یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ طاقتور اور با اثر ہیں۔ وہ بچوں کے مقابلہ میں خود کو کمزور ثابت کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھ کر اپنا کام کرتا ہے کہ اقتدار اور قوت کا خواہش مند بچہ بڑا ہی بوالہوس اور خود غرض ہوتا ہے۔ وہ ایسے بچوں کو ذمہ داری کے کاموں میں لگانے کی کوشش کرتا ہے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان کی رہنمائی اور نگرانی کرتا ہے۔ جب بچوں کو اپنی بڑائی کا اعتراف ہو جاتا ہے تو انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق دلاتا ہے۔ آدمی اپنی طاقت صرف اس وقت استعمال کرتا ہے جب کوئی اس کا مقابل ہوتا ہے۔ اگر استاد اقتدار اور قوت کے طلب گار بچوں کا مقابل نہیں بنتا ہے تو انھیں اپنا لینے اور سیدھی راہ پر چلانے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔

انتقام :

جب کسی بچے کو حسب خواہش توجہ اور اقتدار حاصل نہیں ہوتا تو وہ آمادۂ بغاوت ہو کر انتقام لینے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ انتقامی رویہ نتیجہ ہوتا ہے بچے کی انتہائی مایوسی، ذہنی پراگندگی اور جذباتی انتشار کا۔ ایسے بچوں کی اگر بروقت صحیح طور سے رہنمائی نہ کی جائے تو وہ ذہنی بیمار بن جاتے ہیں اور جن لوگوں سے انھیں شکایت ہوتی ہے ان کو طرح طرح سے پریشان کرنے لگتے ہیں۔ انھیں نہ تو اپنی عزت کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کی عزت کرتے ہیں۔ وہ مایوسی کی حالت میں والدین یا اساتذہ پر بھروسہ نہیں کرتے اور ان سے دور رہ کر

سب کے سامنے بلا کسی خوف و خطر کے گستاخی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کو خطاوار گردانتے ہیں۔ انھیں اپنی شرارتوں اور غیر سماجی حرکتوں کو سن کر خوشی ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کی اصلاح کے لیے ماہر نفسیات اور ماہر امراض ذہنی سے مشورہ کرنا چاہیے اور استاد کو بہر حال محبت اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور ہو سکے تو نتیجہ پر مبنی سزا کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ملاحظہ ہو سید مجاہد حسین زیدی، اتالیق دارالاقامہ، سیکنڈری اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کا تجربہ جس کو ان کے ایک شاگرد نے بیان کیا ہے۔

ایک روز صبح سویرے اٹھتے ہی طلبہ نے دیکھا کہ کسی نے بورڈنگ کے سب لڑکوں کے جوتے بلیڈ یا چاقو سے کاٹ دیے ہیں۔ ایسے کسی حادثے یا ایسی شرارت پر کسی ناسمجھ اور ناتجربہ کار اتالیق کا طریقۂ کار یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بورڈنگ کے چند لڑکوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے کچھ تشدد اور بے جا دھمکیوں کے ذریعہ خطاوار لڑکے کا پتہ لگاتا اور پھر اسے جسمانی سزا دے کر بورڈنگ سے نکلوا کر اپنی انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا لیکن سید مجاہد حسین زیدی نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے نتیجہ پر مبنی سزا کا طریقہ استعمال کیا اور نہایت صبر و تحمل اور محبت سے کام لیا۔ دن بھر خاموش رہے۔ جب شام کے وقت حسب معمول حاضری ہوئی جس میں دن بھر کے معاملات پر تبصرہ ہوتا تھا اور دوسرے دن کے کاموں کا پروگرام مرتب کیا جاتا تھا تو انھوں نے کٹے جوتوں کا مسئلہ یہ کہہ کر پیش کیا کہ ہم جب کسی سماج یا گروپ میں رہتے ہیں تو اس سماج کی ذمہ داریاں اور پابندیاں تو ہم میں سے ہر ایک پر عاید ہوتی ہیں جنھیں پورا کرنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر فرد کے لیے خود اس سماج پر بھی کچھ فرائض اور پابندیاں عاید ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد امید رکھتا ہے کہ سماج ہمارے جائز حقوق برابر پورا کرتا رہے گا جب کوئی فرد سماج کے خلاف کوئی زیادتی یا جرم کرتا ہے تو طاقت ور سماج اسے سزا دے سکتا ہے جیسے چوری، ڈکیتی، قتل اور دیگر جرائم وغیرہ کی سزا حکومت ہر مجرم کو دیتی ہے لیکن اگر کسی فرد کو یہ احساس یا یقین ہو جائے کہ اس کا سماج اس کے ساتھ زیادتی یا ظلم کر رہا ہے تو وہ بے چارہ کیا کرے؟ پورے سماج کو کیسے سزا دے؟ مثال کے طور پر آج رات کے اس حادثے سے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے اس چھوٹے سے سماج میں جس میں بائیس لڑکے اور ایک اتالیق شامل ہیں کوئی شخص ایسا ضرور ہے جسے ہمارے سماج سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے

پہلے اس زیادتی کی کھوج کرنی چاہیے جو ہم بحیثیت مجموعی کسی ایک فرد کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ کوئی ایسی ہی شدید زیادتی ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکا اور اس نے ہم سب کو سزا دی ہے۔

ذرا غور کیجیے یہ کتنا غیر معمولی زاویۂ نگاہ ہے۔ میں اس اذیت ناک اخلاقی دباؤ اور ذہنی تناؤ کو نہ بیان کر سکتا ہوں اور نہ وہ ضروری ہے جس سے شام سات بجے سے رات دو بجے تک ہم سب گزرے۔ نہ کھانا کھایا اور نہ وہاں سے اٹھ سکے۔ چونکہ ہمارے استاد کا کہنا یہی تھا کہ جب تک ہم اس ظلم اور زیادتی کو معلوم نہ کر لیں گے کوئی اور کام نہیں کریں گے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ حادثہ کسی اس سے بھی بڑے حادثے کو جنم دے دے۔

بہر طور رات کو دو بجے ہمارے ایک ساتھی نے قبول ہی کر لیا کہ یہ کام اس نے کیا تھا اور اس مستقل غصہ کے تحت کیا تھا کہ بورڈنگ کے تمام لڑکے ہر موقع پر اسے بے وقوف سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس وقت تک ہمارا وہ ساتھی احساسِ جرم سے اتنا مغلوب ہو چکا تھا کہ اس نے نہ صرف اقبالِ جرم کیا بلکہ زار و قطار روتے ہوئے سب ساتھیوں سے معافی مانگی اور اتالیق صاحب سے درخواست کی کہ اس کے پورے سال کے جیب خرچ سے سب لڑکوں کے جوتوں کی مرمت کرا دی جائے۔ [1]

اظہارِ بے بسی :

مجہول قسم کے بچے عام طور سے خود کو سب سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنا وقت گزارتے ہیں۔ انھیں لکھنے پڑھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی اور استاد کے لیے ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے اچھا یہ ہے کہ استاد انھیں ان کی دلچسپی کے کاموں میں لگا کر ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور انھیں خود شناسی کا موقع دے۔ ان کے کاموں میں رہنمائی کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کرائے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شرارت کا ایک مقصد دوسری شرارت کے لیے اور دوسرا تیسری کے لیے سبب بن جاتا ہے اور یہ سب کچھ ہوتا ہے محض ہمت شکنی کی وجہ سے۔ ہمت شکنی بہت بری بلا ہے۔ بہر صورت یہ کوشش ہونی چاہیے کہ شرارت کے مقصد کو سمجھا

---

[1] غلام حیدر "جامعہ : ماضی کا مستقبل" رسالہ جامعہ اپریل مئی اور جون ۹۶ء جلد نمبر ۹۳ ص ۱۵ تا ۱۷ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جائے۔ چھوٹے بچوں کی شرارتوں کا مقصد محض شرارت ہوتا ہے وہ تفریح طبع کے لیے شرارت کرتے ہیں۔ ان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی البتہ نو بالغوں اور بالغوں کی شرارتوں کے مقاصد کو سمجھنے میں تھوڑی دشواری ضرور ہوتی ہے لیکن سمجھ دار استاد ان کو سمجھ کر ہی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

بچے عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر خود کو چھپانے کا فن سیکھ لیتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ اصلاحی کوشش پر بچے اپنے تاثرات کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اگر استاد توجہ کے خواہش مند بچے کی طرف فوراً متوجہ ہو جائے تو وہ وقتی طور پر اپنا رویہ بدل سکتا ہے لیکن طاقت اور اقتدار کا طالب اپنی شرارتوں سے آسانی سے باز نہیں آتا اور انتقام لینے والا بچہ استاد کی نصیحت سے اور زیادہ آمادۂ شر ہوتا ہے' اس کے علاوہ مجہول بچہ استاد کی محبت اور توجہ ملنے پر آسانی سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔

جب کبھی کسی استاد کو اپنے کسی طالب علم کے غلط اور ناپسندیدہ رویے کا احساس ہو تو اسے فوراً اپنے قریب لاکر نہایت محبت اور عزت کے ساتھ یہ یقین دلایا جائے کہ اس کی شرارت کا مقصد یا وجہ سمجھ لی گئی ہے۔ اس پر تنقید بالکل نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بحث نہ کی جائے کہ غلط کام کیوں کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقصد کو سمجھا کر اس میں اعتدال پیدا کرایا جائے۔ کیوں کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ ماضی سے زیادہ حال پر زور دینا چاہیے۔ غیر طبعی بچے کی شرارت کا مقصد سمجھنے سمجھانے کے لیے اس کے الفاظ سے زیادہ اس کے جسمانی تاثرات کو دیکھا جائے۔ وہ کبھی ہنس کر کبھی رو کر اور کبھی محض آنکھ اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے مقصد کو ظاہر کر سکتا ہے۔

بات چیت کے دوران درج ذیل قسم کے سوالات کی مدد سے بچے کی شرارت اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ ہو سکتا ہے آپ کو محض توجہ کی تمنا ہو۔

۲۔ ہو سکتا ہے آپ دوسروں کو اس لیے تکلیف دینا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کو تکلیف دیتے ہیں۔

۳۔ ہو سکتا ہے آپ آزاد رہ کر کام کرنا پسند کرتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ آپ کی بات مانی جائے۔

۴۔ ہو سکتا ہے آپ سب سے مایوس ہو کر الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہوں وغیرہ۔

بعض اوقات باہمی گفتگو ہی بچے کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اچھا یہ ہے کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعمیری کاموں میں مصروف رکھا جائے۔ کام کے دوران ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ غیر طبعی بچوں کو طبعی بچوں کے گروپ میں شامل کیا جائے اور جب کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو جماعتی مباحثہ یا باہمی مشورہ سے اسے حل کرنے کی کوشش کی جائے

مختصر یہ کہ بچوں کی نفسیات کو جاننے اور سمجھنے والا استاد اپنے شاگردوں کو بہت کم دل برداشتہ اور مایوس ہونے کا موقع دیتا ہے۔ وہ بروقت مناسب رہنمائی اور ہمت افزائی کے ذریعے بچوں کا دل موہ لیتا ہے۔ وہ ان سے محبت کر کے ان کے دل میں اپنے اوپر بھروسہ پیدا کراتا ہے اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ وہ جماعت کے مفید اور کار آمد رکن ہیں۔

اصول اور ضابطے کا تعیّن

ایک استاد اپنے طلبہ کے سامنے اچھے اخلاق اور کردار کی اہمیت اور ضرورت پر لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد ایک طالب علم نے سوال کیا کہ جناب یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ ہمیں اچھا کیوں بننا چاہیے لیکن یہ نہیں سمجھ میں آسکا کہ اچھا کس طرح بنا جائے۔ ہمارے اکثر استادوں اور والدین کے ذہن میں یہی سوال آتا ہوگا کہ اچھا ڈسپلن کس طرح قائم کیا جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ ڈسپلن کیوں سکھایا جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ ڈسپلن کسے کہتے ہیں لیکن ان کا یہ سوال باقی رہتا ہے کہ :

۱۔ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے جس کو استعمال کرنے سے ڈسپلن سے متعلق مسئلے پیدا ہی نہ ہوں۔

۲۔ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ اخلاقی معیار کا تعیّن کیا جا سکے۔

۳۔ کیا ہم ڈسپلن کی تعریف اور مقاصد کے علم سے بچے کی تربیت کا کام اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی نشوونما پر غلط اثر نہ ہو۔

بچوں کو یہ سمجھانے میں کوئی نقصان نہیں کہ کس قسم کی عادتوں اور طور طریق کو عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور کیوں۔ انھیں یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ نیک اور بد بچے میں کیا فرق ہوتا ہے یا کسی بچے کو نیک یا بد کیوں کہا جاتا ہے۔

اکثر ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اخلاقی ضابطوں کے تعیّن کا بچوں پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔ شرارت اور آزادی بچے کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کی آزادی پر اخلاقی معیار کی پابندی لگانے کا مطلب ہے اسے بد اخلاقی اور بے ضابطگی کے لیے آمادہ کرنا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دو تین برس کے بچوں کو گھر میں جن چیزوں کو چھونے اور لینے سے منع کیا جاتا ہے وہ ان ہی چیزوں کو چھونے اور لینے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں۔ مثلاً دو برس

کی آمنہ کو اس کی امی نے اپنی عطر کی شیشی اٹھانے سے روکا تھا۔ ایک روز آمنہ نے موقع ملتے ہی عطر کی شیشی اٹھائی اور اپنی گڑیا کے اوپر سارا عطر مل دیا۔ کسی بچے سے یہ امید کرنا غلط ہے کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔

ڈسپلن سکھانے کے لیے بالکل ضروری نہیں کہ مثبت اور منفی ضابطوں اور اصولوں کی لمبی چوڑی فہرست تیار کی جائے۔ اس قسم کے ضابطوں اور اصولوں سے نہ صرف بچوں کو بلکہ بڑوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی ضابطہ یا اصول کی زبردستی پابندی کرائی جاتی ہے تو اس سے بچے کو بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ زبردستی ڈسپلن سکھانے سے بچے میں ضد کا مادّہ پیدا ہوتا ہے اور وہ خود کو کمزور اور پست ہمت سمجھ کر مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ سمجھ دار والدین شروع میں چند ایسے اصولوں کی پابندی کرنا سکھاتے ہیں جو بچے کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً وقت پر سونا اور وقت پر کھانا۔ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھولینا اور کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونا اور غرارے کرنا۔ کھیل کے سامان کو استعمال کے بعد مقررہ جگہ پر رکھنا وغیرہ۔ ان اصولوں کی پابندی کے لیے بچوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور جو کچھ سکھانا ہوتا ہے اسے نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ سکھایا جاتا ہے۔

ڈسپلن کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچے کی معمولی معمولی شرارتوں اور بدعنوانیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ کسی شرارت اور بدعنوانی کو دیکھ کر فوراً اس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شرارت یا بدعنوانی فوری طور پر بڑی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے وہی تھوڑا وقت گزرنے کے بعد معمولی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثلاً یوسف اور منو اپنی امی کے بستر پر اخبار کے کاغذوں سے گڑیوں کے گھر بناتے ہیں۔ ان کے کھیل کو دیکھ کر خفا نہ ہوا جائے اور نہ ہی انھیں بستر پر کھیلنے سے منع کیا جائے۔ بچوں کے کھیل سے بستر خراب نہیں ہوتا لیکن کھیل کو روک دینے سے بچوں پر خراب اثر ہوتا ہے۔ یا اختر کھانا کھانے کے بعد پپیتا نہیں کھاتا ہے تو اسے پپیتا کھانے پر مجبور نہ کیا جائے کوئی دوسرا پھل جو اسے پسند ہو یعنی آم یا کیلا دے دیا جائے۔ بچوں کی معمولی معمولی حرکتوں پر خفا ہونے کے بجائے صبر و تحمل سے کام لینا اچھا ہوتا ہے۔ اصول اور ضابطے کے شکنجے میں کس کر رکھنے سے بچے کی نشوونما پر بہت غلط اثر ہوتا ہے۔ اصول اور ضابطے کی پابندی کرنے یا نہ کرنے کے نفع و نقصان کو سمجھا دینے سے بچے کو یہ سمجھنے میں ضرور مدد ملتی ہے کہ کوئی ضابطہ یا اصول اس پر حکومت کرنے یا اسے اپنے

قابو میں رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اس کے فائدے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ تقریباً پانچ برس کا بچہ نہایت آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے یا سڑک پر اسکیٹنگ نہ کرنے کے لیے کیوں کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کو آسان زبان میں پیار محبت کے ساتھ سمجھانے سے بچے کو شروع ہی سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کوئی اصول اور ضابطہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ زندگی آرام سے گزرے۔

چھوٹے بچوں سے یہ توقع کرنا مناسب نہیں کہ وہ اصول اور ضابطے کی وجہ اور ضرورت کو سننے کے بعد اس پر عمل بھی کرنے لگیں گے۔ چھوٹے بچوں میں مدلل بات کو سمجھنے یا مدلل طریقہ سے بات کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کی سمجھ اور بڑوں کی سمجھ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بڑے جس بات کو یا جس دلیل کو آسان سمجھتے ہیں وہ بچوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہوتی مثلاً یہ کہنا بچے کی سمجھ میں نہیں آسکے گا کہ دودھ پیتے رہنے سے جسم میں طاقت آتی ہے۔ ہاں اگر بچے کو آپ پر بھروسہ ہے اور آپ پیار اور محبت کے ساتھ دودھ پیتے رہنے کو کہتے ہیں، تو وہ آپ کی بات مان لے گا اور آپ جو کچھ کرنے کو کہیں گے وہ کرتا رہے گا۔

پانچ برس سے کم عمر کے بچوں میں کیوں اور کیا کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یعنی منطقی باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں، اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ بچے کو جو بات سمجھائی جائے دلائل کے ساتھ سمجھائی جائے مثلاً آپ تیز دھار والا چاقو دکھا کر یہ سمجھانا چاہیں کہ اس کی دھار پر ہاتھ پھیرنے سے ہاتھ کٹ جاتا ہے اس لیے اس کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ وقتی طور پر چاقو کو ہاتھ نہ لگائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ چاقو سامنے رکھا ہو اور بچہ اسے نہ اٹھائے۔

بعض اوقات قواعد و ضوابط کی پابندی وہ بچے بھی نہیں کر پاتے جو بڑی عمر کے ہوتے ہیں اور اچھے خاصے سمجھ دار ہوتے ہیں مثلاً دس برس کا عاطف یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے والد نے صحن کی نو فٹ اونچی دیوار سے نیچے کودنے کے لیے منع کر رکھا ہے جب اپنے ہم جولیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھتا ہے اور ان کو کودتے دیکھتا ہے تو خود بھی کودنے لگتا ہے اور اپنے والد کی ہدایت کو بالکل بھول جاتا ہے۔ بہر حال ڈسپلن سے متعلق اصولوں کی آسان اور مناسب وضاحت سے بچے کو فائدہ ہوتا ہے۔ بچوں کو یہ بات خاص طور سے سمجھانی چاہیے کہ اصول اور ضابطے بہت سوچ سمجھ کر بنائے جاتے ہیں ان کا مقصد بچوں کو دبانا نہیں بلکہ انھیں

Maulana Azad National Urdu University Library
Acen. No. 19101
Date 2 MAR 2007

ناپسندیدہ حرکتوں سے روکنا ہوتا ہے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔

اچھا تو یہی ہے کہ گھر یا اسکول میں بچوں کو کوئی ایسا موقع ہی نہ دیا جائے کہ وہ کوئی مسئلہ پیدا کر سکیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کس وقت کس قسم کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ڈسپلن سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہ ہو جس کو حل کرنا یا جس پر قابو پانا مشکل ہو اور کسی ایسی پریشانی سے دوچار ہونا پڑے جسے دور نہ کیا جا سکے۔ ماں باپ یا استاد کو بچوں کے مسئلوں کو حل کرتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بچہ فطرتاً کھیلنے کودنے، دوڑنے بھاگنے، کھوج لگانے، جاننے اور آپس میں مقابلہ کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ وہ اپنی اس بے چینی اور بے قراری کو دور کرنے کے لیے جو کام کرتا ہے وہ ان کے لیے تکلیف دہ بن جاتے ہیں اور ان کا شمار شرارتوں میں ہونے لگتا ہے۔ شرارتوں سے باز رکھنے کا مطلب ہے بچے کو اس کی فطری احتیاج پورا کرنے سے روکنا۔

شرارتوں کا اصل علاج یہ ہے کہ شریر بچے کی احتیاج (ضرورت) کو معلوم کیا جائے اور پھر اسے مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔ مثلاً ڈرائنگ روم میں کودنے پھاندنے والے بچے کو صحن میں کودنے پھاندنے کا شوق دلایا جائے۔ جو بچہ اپنے کسی کھلونے کو توڑ رہا ہو تو اسے اپنا کام پورا کر لینے دیا جائے۔ گھر میں شیشے کے برتنوں اور آرائشی چیزوں کو کمرے میں اتنی اونچائی پر رکھا جائے کہ ڈیڑھ دو سال کے بچے کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے۔ دیوار پر لکیریں کھینچنے والے بچے کو مختلف قسم کے رنگوں کا ڈبہ لا کر دیا جائے اور اس کو کاغذ پر لکیریں کھینچنے کا شوق دلایا جائے۔ یا اگر ۷ برس کے نسیم اور اس کے پانچ برس کے چھوٹے بھائی احمد میں سائکل چلانے پر جھگڑا ہوتا ہے تو دونوں کو ایک ایک سائیکل دلا دی جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دونوں کے لیے سائیکل چلانے کا وقت مقرر کر دیا جائے۔

ڈسپلن کی ترتیب کے لیے نہ تو بچے کو بالکل آزاد چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے شکنجے میں کس کر رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بچے کو ایسے کاموں سے ضرور روکا جائے جو خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوں۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ بچہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں سے جان سکے۔ اسے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا آئے۔ بعض والدین گھر کے ماحول کو اتنا غیر دلچسپ اور بے کیف بنا لیتے ہیں کہ بچہ کی امنگیں دب کر رہ جاتی ہیں اور اسے اپنی کوشش اور غلطی (سعی و خطا) کے ذریعے سیکھنے کا موقع ہی

نہیں ملتا۔ مثلاً گھر میں شیشے کی نازک اور خوبصورت چیزیں نہ تو ایسی جگہ رکھی جائیں جہاں دو برس کے بچے کا ہاتھ پہنچ سکے اور نہ ہی کمرے میں رکھے لیمپ، رسالوں کتابوں اور تصویروں کو اتنی اونچائی پر رکھا جائے کہ بچہ انھیں ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ گھر کے ماحول کو ایسا بالکل نہ بنایا جائے کہ بچے کو اظہارِ ذات کا موقع ہی نہ ملے اور اس کی امنگیں دب کر رہ جائیں۔

بچے کو اس کی جبلتوں یعنی بھاگنا دوڑنا، کھوج لگانا، توڑنا اور بنانا اور آپس میں مقابلہ کرنا وغیرہ کو پوری نہ ہونے دینے اور اس کی ضرورت سے زیادہ حفاظت کرنے سے اس کی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بالیدگی اور نشوونما کے فطری عمل کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو آزادی ملے اور اس کی نقل و حرکت اور کوششوں کی اس طرح نگرانی کی جائے کہ پوشیدہ صلاحیتیں ٹھیک سے اجاگر ہو سکیں۔

ڈسپلن کی تربیت کے کام میں ان لوگوں سے بڑی مدد ملتی ہے جو بچے کے قریب رہتے ہیں اور جن پر اسے بھروسا ہوتا ہے۔ دراصل بچہ ان ہی لوگوں کے طرزِ عمل اور کردار کی نقل کرتا ہے جو اس کے قریب رہتے ہیں مثلاً ماں باپ، دادا دادی اور دیگر عزیز و اقارب اس لیے ضروری ہے کہ یہ سب خود کو بچے کے لیے اچھا نمونہ بنائیں۔ مشاہدہ اور نقل کے ذریعہ بچہ اور بالغ دونوں سیکھتے ہیں مثلاً ایک ماں اپنے کچن اور مکان کو جس طرح صاف رکھتی ہے اسی طرح اس کی تین برس کی بیٹا اپنی گڑیوں کے گھر کو صاف رکھے گی۔ کسان کا بیٹا اپنے باپ کو دیکھ کر کاشتکاری کا فن سیکھ لیتا ہے۔ بڑھئی کا بیٹا اپنے باپ کو دیکھ کر نجاری میں دلچسپی لینے لگتا ہے یا آج کل فلمی اداکاروں کو دیکھ کر بچے، بالغ اور نوجوان ان جیسا حلیہ بنانے لگتے ہیں۔

ماں باپ اور استاد کو اپنی زندگی میں وہی خوبیاں پیدا کرنی چاہییں جو وہ اپنی نئی نسل کو سکھانا چاہتے ہیں۔ نقل کرنے کے اصول کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ بچے کو ماں باپ اور استاد پر بھروسا ہو۔ بھروسا پیدا ہوتا ہے محبت اور عزت کرنے سے۔ محبت اور عزت کی وجہ سے بچہ ماں باپ اور استاد کے قریب آتا ہے اور ان پر بھروسا کرتا ہے۔ ڈسپلن کی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کے کاموں پر تنقید نہ کی جائے اور نہ ہی اس کے غیر معیاری کاموں کو معیاری کہہ کر بے جا تعریف کی جائے۔ البتہ مناسب طریقہ سے ہمت افزائی ضرور کی جائے۔

گھر میں ماں باپ کو یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ کسی بھی صورتِ حال میں ان دونوں

میں اختلاف رائے نہ ہو۔ ایسا کرنے سے بچے کو اچھی باتیں سیکھنے میں مدد ملے گی۔ ڈسپلن سے متعلق مسئلے اس وقت زیادہ پیدا ہوتے ہیں جب بچہ ذرا بڑا ہو کر گھر سے باہر نکلتا ہے اور دوسرے بچوں اور بڑوں سے ملتا ہے۔ مثلاً راشد شام کے وقت محلے کے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے جاتا ہے۔ ایک روز کھیل کے دوران اس کی آنکھ میں چوٹ لگ جاتی ہے۔ وہ روتا ہوا گھر آتا ہے۔ ماں اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی ہے اور اس کے ساتھیوں کو برا بھلا کہتی ہے لیکن اس کے والد یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ کوئی بات نہیں۔ کھیل میں چوٹ تو لگتی ہی رہتی ہے۔ اس طرح کے مختلف تاثرات کی وجہ سے راشد کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو سکتی ہے کہ کس کی بات مانی جائے اور کون اُس کا زیادہ ہمدرد ہے۔

ڈسپلن کی تربیت کے لیے اشد ضروری ہے کہ ماں باپ اور استاد مستقل مزاجی سے کام لیں۔ جن اصولوں کو سکھانا ہو ان پر مسلسل عمل کرایا جائے۔ عمل کرانے کے لیے شدت اور سختی کے بجائے حتی الامکان محبت، نرمی اور درگزر سے کام لیا جائے۔ مثلاً اگر یوسف آلو کی سبزی اور گوشت کھانا پسند نہیں کرتا ہے تو اسے زبردستی آلو اور گوشت کھلانا برا ہے یا وہ کسی دن کھانے کی میز یا دستر خوان پر ہاتھ دھوئے بغیر آجاتا ہے تو اس پر ناراض ہوا جائے یا وہ کسی روز سونے کے مقررہ وقت پر نہیں سوتا ہے تو اسے برا بھلا کہا جائے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ بچے کو پسندیدہ اصول کو سکھانے کے لیے ان پر عمل ضرور کرانا چاہیے لیکن کبھی کبھی بچے کی ضد اور لاپرواہی کو نظر انداز بھی ضرور کرنا چاہیے۔ اس طرح کے طرز عمل سے ماں باپ اور بچے کے باہمی تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہونے کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

اکثر والدین اور اساتذہ مقررہ اصولوں کو سکھانے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کب اور کہاں کتنی سختی اور کتنی نرمی سے کام لینا چاہیے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ بچے پر کس قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ کوئی بچہ پابندیوں کو پسند نہیں کرتا۔ سختی اور سزا سے کوئی بچہ خوش نہیں ہوتا۔ آزادی کو سب بچے پسند کرتے ہیں اور آزادی بھی وہ آزادی جس پر کوئی پابندی نہ ہو۔ بتایئے ایسی صورت میں ڈسپلن کے لیے کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔

مفکرین تعلیم اور تعلیمی کارکنان کا خیال ہے کہ ڈسپلن کی تربیت میں آمرانہ اور تحکمانہ طرز عمل بالکل اختیار نہ کیا جائے۔ یہ طرز عمل بچے کو ضدی، ڈرپوک، بداخلاق اور بے حس بناتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچے کو آزادی دی جائے لیکن اس کی مناسب طریقے سے نگرانی اور

رہنمائی کرنا چاہیے۔ اس کی انفرادیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس کی رائے کا احترام کیا جائے' اس کی دلچسپیوں کو پورا کیا جائے۔ اسے بچہ ہی سمجھا جائے نہ کہ چھوٹا سا آدمی۔ وہ ناسمجھ ہوتا ہے اور محبت کا بھوکا۔ اسے سیدھی راہ پر چلانے کے لیے جو بھی تدابیر اختیار کی جائیں ان کے ذریعے اس کی احتیاجات پوری ہونا چاہییں اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کے مواقع ملنا چاہییں۔

چند اصلاحی تدابیر

اگر قواعد و ضوابط متعین کر لینے سے ڈسپلن کے مسئلے حل ہو جاتے تو والدین اور اساتذہ کے لیے کوئی مشکل، مشکل نہ ہوتی اور کوئی پریشانی، پریشانی نہ رہتی۔ مسائل اور زندگی لازم اور ملزوم ہیں۔ زندگی ہے تو مسئلے بھی ہیں۔ جہاں بچے ہوں گے وہاں مسئلے بھی ضرور ہوں گے۔ سوچنے سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ بچے بچے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ دار اور تجربہ کار بڑوں کا چھوٹا نمونہ نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ ان کی دنیا بڑوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ انھیں بڑوں کی دنیا میں رہنے اور خوش و خرم رہنے کا فن سیکھنے میں بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً جانے بوجھے اصولوں کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی بد سلوکی اور بد اخلاقی محض توجہ طلبی یا انتقامی جذبے کے تحت ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر والدین اور اساتذہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کردار کی اصلاح کس طرح کی جائے اور ڈسپلن کس طرح باقی رکھا جائے؟

اس سوال کا کوئی ایک بندھا ٹکا جواب نہیں ہو سکتا۔ ہر بچے کی شخصیت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر بچے کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جو اصلاحی تدبیر کسی ایک بچے کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے وہی دوسرے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

ڈسپلن کی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ بچے کی بد سلوکی اور بد اخلاقی کو اس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ دیکھا جائے کہ بد سلوکی کی اصل وجہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ کیا اور کیوں کو سمجھے بغیر جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے بچہ آزردہ خاطر، دل شکستہ اور ضدی ہو جاتا ہے۔ شرارت یا بد سلوکی کے مقصد کو جاننے کے بعد اس میں اعتدال پیدا کرانا ہوتا ہے اور پھر بچے کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ سماج میں خوش و خرم زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھا جائے۔

ڈسپلن کی تربیت کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ بعض طریقے وہ ہیں جو خارجی ڈسپلن کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً سزا اور انعام، مقابلہ، تنبیہ اور خفگی وغیرہ بعض وہ ہیں جو داخلی ڈسپلن کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً خاموشی اور درگزر، پیار محبت اور ہمت افزائی وغیرہ۔ ضروری نہیں کہ وہ سب طریقے استعمال ہی کیے جائیں یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ ان کے استعمال کی افادیت کا تعلق موقع محل، طریقۂ استعمال اور بچے کی انفرادیت سے ہوتا ہے۔

ا۔ سزا اور انعام:

جسمانی سزا کا مطلب ہے طاقتور کا کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ بچے کو جسمانی سزا صرف اس وقت تک ملتی ہے جب تک وہ مقابلہ کرنے یا بدلہ لینے کے قابل نہیں ہوتا۔ سزا ملنے پر کوئی بچہ خوش نہیں ہوتا۔ سزا کی وجہ سے بچے کو اپنی بے عزتی اور بے حرمتی کا بری طرح احساس ہوتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ سزا کے خوف سے بچے کی شخصیت میں دہرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

تقریباً سو سوا سو برس پہلے ہربارٹ اسپنسر نے جسمانی سزا کے خلاف پرزور آواز اٹھائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جمہوری طرز زندگی سکھانے کے لئے سزا کا استعمال بالکل غلط اور بے کار ہے۔ اس کے بعد دور حاضر کے ماہر نفسیات Piaget (پیازے) نے جسمانی سزا کو انتقامی انصاف کہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اچھا سماجی انسان بنانے کے لیے تعمیل حکم اور تابعداری کی تعلیم کے بجائے خود سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے اور اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی تعلیم دینی چاہیے۔

ہمارے یہاں والدین اور اساتذہ کی بڑی تعداد ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ڈسپلن کی تربیت کے لیے سزا اور انعام کا استعمال ضروری ہے۔ انھیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انعام سے بچہ لالچی بن جاتا ہے اور کام کو کام سمجھ کر نہیں بلکہ انعام حاصل کرنے کے لالچ میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انعام بچے کی کامیاب کوشش کے بدلہ میں یا کسی کام کو مقررہ معیار کے مطابق کام کر لینے پر دیا جاتا ہے، خواہ کام غلط یا صحیح کسی بھی طریقے سے کیا گیا ہو۔ انعام دینے والے یہ نہیں سوچتے کہ کام خود اپنا انعام ہوتا ہے۔ بعض اوقات انعام ہمت افزائی کے

بجائے ہمت شکنی کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ انعام حاصل کرنے کے بعد بچے کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اُسے آیندہ بھی اسی طرح انعام ملتا رہے۔ اگر آیندہ اس کی یہ خواہش یا ارمان پورا نہیں ہوتا تو وہ خود کو کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ ہمارے یہاں انعام کا طریقہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے مضر اثرات کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں ہوتی۔ یعنی انعام دینے والوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ بچے کی کامیابی پر انعام کے ذریعے خوشی منانے سے اس میں مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں دوسروں کا تعاون حاصل کرنے' دوسروں کی مدد کرنے یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

تربیت یا ڈسپلن کی تربیت کے لیے جسمانی سزا کا استعمال تو کسی بھی صورت میں مناسب نہیں۔ اس کے استعمال سے شخصیت کا خون کرنے اور انسانیت کو کچلنے کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ اس کے استعمال سے بچے کی بے حرمتی اور بے عزتی ہوتی ہے۔ وہ بے حس' بے غیرت اور ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ اس میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ باغی بن کر غیر سماجی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جسمانی سزا کے استعمال سے صرف سزا دینے والے کو یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ وقتی طور پر اس کے دل کا غبار نکل جاتا ہے۔ داخلی ڈسپلن کے حامی انعام اور سزا دونوں کے استعمال کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ انعام اور سزا کے استعمال سے بچے کے اندر تصنع' بناوٹ اور خود نمائی جیسی بری عادتوں کے علاوہ جھوٹ بولنے' دھوکا دینے اور دوسروں کو بلاوجہ مرعوب کرنے کی عادت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے اگر انعام کے طریقہ کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعے بچے کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور اسے ترقی کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً چار برس کا یوسف نرسری اسکول جانے کے لیے اپنے کپڑے خود پہننے کے لیے کامیاب کوشش کرتا ہے اور اسکول سے واپس آکر اپنے کپڑے اتار کر انھیں ٹھیک سے کپڑوں کی الماری میں رکھ دیتا ہے۔ اس کی امی خوش ہو کر اسے شاباشی دیتی ہیں اور تعریف کرتی ہیں تو یوسف خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کی تعریف یا انعام سے بچے کی جذباتی اور ذہنی نشوونما پر اچھا اثر ہوتا ہے یا اکبر کو اسکول میں صاف ستھرا رہنے اور باقاعدہ کام کرنے پر انعام دیا جاتا ہے اور انعام ملنے پر اس کی امی اور ابو خوشی کا اظہار کرتے ہیں تو اکبر کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

۲۔ تنبیہ :

تنبیہ سے مراد ہے آگاہی۔ تنبیہ کے مناسب اور جائز استعمال سے بچے کو اپنے نفس پر قابو پانے اور قواعد و ضوابط کی پابندی کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے بچے کو یہ سمجھا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ بے ضابطگی اور بے قاعدگی کی وجہ سے کیا نقصان ہو سکتا ہے مثلاً سات برس کے اختر کو اوقات کی پابندی سکھانے کے سلسلے میں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اگر شام کے کھیل کے بعد وہ مقررہ وقت کے بعد گھر واپس آیا تو اپنے ماموں کے وہاں کھانے پر نہیں جا سکے گا اس لیے کہ وہاں سات بجے تک پہنچنا ضروری ہے یا رات کو سونے کے مقررہ وقت کے بعد ٹی۔وی پروگرام دیکھتے رہنے سے صبح سویرے جاگنے میں زحمت ہوگی وغیرہ۔

تنبیہ کا استعمال کم سے کم کیا جائے اور تنبیہ کرتے وقت کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جو قابل عمل یا قابل یقین نہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ ندیم اگر تم امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو تم کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔ بے جا تنبیہ سے بچے کی جذباتی صحت کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے

۳۔ محبت اور شفقت :

ڈسپلن کی تربیت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بچے کو کسی بھی صورتِ حال میں محبت اور شفقت سے محروم نہ کیا جائے۔ اسے یقین دلایا جائے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے یا جو ہدایت کی جاتی ہے وہ اس کی بھلائی اور ترقی کے لیے ہوتی ہے۔ بچے کے لیے ماں باپ اور استاد کی محبت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ محبت کے سوا کوئی چیز اس کا دل نہیں موہ سکتی۔ بچہ محبت کا بدلہ محبت سے دیتا ہے۔ جو بچے سے محبت کرتا ہے بچہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی توقعات کو پورا کرنے کی بس بھر کوشش کرتا ہے یہ ضرور ہے کہ محبت کا اظہار محض عارضی اور وقتی طور پر نہ ہو بلکہ اس میں تسلسل اور استقلال ہو اور وہ بالکل غیر مشروط ہو۔ مشروط محبت سے ڈسپلن کی تربیت میں زیادہ کامیابی نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہنا غلط ہے کہ بیٹا! اگر تم ہمارا کہنا نہیں مانو گے تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے یا اکبر اگر تم نے دودھ نہ پیا تو ہم تم سے بات نہیں کریں گے۔

۴۔ ہدایت اور نصیحت :

ڈسپلن کی تربیت میں محض ہدایت اور نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لیے ماں

باپ اور استاد کو ہدایت اور نصیحت سے احتراز کرنا چاہیے۔ ہر وقت کی ہدایت اور نصیحت کو سنتے سنتے بچہ بے حس اور لاپرواہ ہو جاتا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ نصیحت کرنے کے بجائے جو کچھ کرانا ہو اسے کرالیا جائے۔ بچہ فطرتاً نقال ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ گھر اور اسکول کے ماحول کو مثالی بنایا جائے۔

ڈانٹ ڈپٹ :

جب کوئی بچہ ناپسندیدہ اور غیر سماجی حرکت کرے تو اس پر خفا ہونے کے بجائے اس کی حرکت کو نظر انداز کیا جائے۔ بعض اوقات غصہ میں ایسی بات منہ سے نکل جاتی ہے جو بالکل ناقابل عمل ہوتی ہے اس لیے بچے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا مثلاً :

"اختر خاموش ہو جاؤ ورنہ تمہاری زبان کاٹ لی جائے گی یا "اگر رونا بند نہیں کرو گے تو گھر سے باہر نکال دیے جاؤ گے" اس قسم کے غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بچہ نڈر اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے والدین یا استادوں کے غصہ کو خوب سمجھتا ہے اور یہ بھی خوب سمجھتا ہے کہ غصہ کی حالت میں جو دھمکی دی جاتی ہے وہ محض وقتی دھمکی ہوتی ہے۔ ڈرانے دھمکانے کا طریقہ اس لیے بھی غلط ہے کہ والدین کی طرف سے شروع ہی میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی جنگ اس طرح نہیں جیتی جاتی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی فریقین یا کوئی ایک فریق اپنے دانو پیچ دوسرے کو بتادے۔ بہتر یہ ہے کہ صورت حال کے مطابق رویہ اختیار کیا جائے اور کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جو قابل عمل نہ ہو۔ جو کچھ کہا جائے وہ ایک ہی مرتبہ نہایت یقین، سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ کہا جائے۔ محض خفا ہونا اور الٹی سیدھی باتیں کہنا بالکل بے سود ثابت ہوتی ہیں۔

۵۔ اظہار رنج و غم :

دیکھا گیا ہے کہ اکثر والدین اپنے بچے کی ناکامی یا کسی کمزوری کو سن کر بے حد مغموم اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں بچہ والدین کو غم زدہ دیکھ کر خود بھی ارادتاً غمگین اور افسردہ ہو جاتا ہے اور پریشان ہو کر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے زیادہ قابل رحم اور قابل ہمدردی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس طرح اس کے دل میں دوسروں کو دینے اور دوسروں کی خدمت کرنے کا خیال پیدا ہونے کے بجائے دوسروں سے لینے اور دوسروں سے امیدیں

وابستہ کرنے کی عادت پیدا ہونے لگتی ہے جو سماجی نقطۂ نظر سے بے حد بری بات ہے۔

۶۔ ضرورت سے زیادہ حفاظت :

اکثر مائیں اپنی لاعلمی اور بے جا محبت کی بناد پر بچے کی ضرورت سے زیادہ حفاظت کرتی ہیں۔ انھیں یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ بچے کو اپنی حفاظت کی خود بہت فکر رہتی ہے۔ خود اپنی حفاظت کرنا بچے کی فطرت میں شامل ہے۔ حد سے زیادہ حفاظت اور نگرانی کی وجہ سے بچے کو حفاظت کے لیے اپنی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملتا اور بالآخر وہ دوسروں کے سہارے جینے اور خود پر کسی قسم کا بھروسا نہ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

۷۔ تشویش اور خوف :

بعض والدین بچے کو اپنے قابو میں رکھنے یا اسے ڈسپلن سکھانے کے لیے بھوت پریت کتے بلی اور بوڑھے باباو غیرہ کا نام لے کر غیر ضروری طور پر خوف زدہ کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ نام بچے کے لیے مستقل تشویش اور خوف کا سبب بن جاتے ہیں اور انھیں ہر وقت والدین کے سایے میں رہنے اور ان کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔ جس بچے کو آزادی کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے اور کھیلنے کودنے کے مواقع ملتے ہیں وہ نڈر، خود مختار اور آزاد ہوتا ہے۔ اس میں نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کا سہارا لیے بغیر اپنے مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب کبھی دوسروں کے مشورے یا مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو بے جھجک اور بے تکلف ہو کر حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہ ہے کہ کسی بھی صورتِ حال میں بچے کو ڈرایا یا خوف زدہ نہ کیا جائے۔ بچپن کا خوف اور تشویش آگے چل کر بمشکل تمام ختم ہوتی ہے۔

ایک وقت میں ایک ہی مسئلہ :

بعض والدین اور اساتذہ بچے کی کسی ایک غلطی پر اس کی اگلی پچھلی غلطیوں کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں اور ان سب کی ایک ساتھ اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس سے بچے کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور پھر بچے کو کم اور بڑوں کو زیادہ الجھن اور پریشانی ہوتی ہے۔ والدین یا اساتذہ چاہتے ہیں کہ بچہ ان کا حکم مانے۔ ان کے مشورے کے مطابق کام کرے۔ ان

کی امیدوں اور مطالبوں کو پورا کرے۔ وہ اپنے مطالبوں اور امیدوں کو پورا کرانے کے لیے بچے کو طرح طرح سے بہکاتے پھسلاتے ہیں۔ وہ بچے کو جتنا زیادہ بہکاتے اور پھسلاتے ہیں وہ ان سے اتنا ہی زیادہ دور ہوتا جاتا ہے۔ اس قسم کی دوری کو مٹانے اور اختلاف کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے بچے کی کسی ایک کمزوری اور غلطی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ کوشش نہایت سمجھداری اور حسن سلوک کے ساتھ اس وقت تک جاری رکھی جائے جب تک غلطی یا کمزوری کی پورے طور سے اصلاح نہ ہو جائے۔ اس طرح ایک غلطی کی اصلاح اور کمزوری کے دور ہو جانے سے بچہ خود اپنی دوسری کمزوریوں اور غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ مثلاً :

بدرالاسلام جس کی عمر ۱۲ سال تھی اپنے کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ خود بھی گندہ رہتا تھا اور اپنے کمرے کو بھی گندہ رکھتا تھا۔ اسے نہ تو اپنے ریڈیو کو استعمال کرنے کا سلیقہ تھا اور نہ ہی اپنے روزانہ استعمال کے کپڑوں کو ٹھیک سے رکھتا تھا۔ اسکول میں گھر پر کرنے کے لیے جو کام دیا جاتا تھا اسے بھی پورا نہیں کرتا تھا۔ اس کی کتابیں اور کاپیاں بھی ادھر ادھر پھیلی پڑی رہتی تھیں۔ بدر کی والدہ نے اس کی یہ حالت دیکھنے کے بعد ہمارے مشورے سے سب سے پہلے اس کے ریڈیو کے متعلق بات کی اور ریڈیو کو ٹھیک سے رکھنے اور چند دلچسپ پروگرام سننے کا شوق دلایا۔ اس طرح پیار محبت کے ساتھ ریڈیو کے متعلق بات کرنے سے بدر میاں کو اپنا ریڈیو ٹھیک سے رکھنے اور چند دلچسپ پروگرام سننے کا شوق ہوا۔ اس کے بعد ایک روز مدرسے کی کتابوں اور کاپیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ بدر کو اپنا کمرہ صاف رکھنے اور اپنے استعمال کی چیزوں کو بالترتیب رکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اگر ان سب مسئلوں کی طرف ایک ساتھ توجہ دلائی جاتی تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

جب والدین یا استاد کسی ایک مسئلے کو خواہ کتنا ہی مشکل یا آسان کیوں نہ ہو' اپنے اخلاق اور حسن سلوک کے ذریعے حل کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو بچہ فطرتاً دوسرے مسئلوں کو خود بخود حل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ ایک کامیابی دوسری کامیابی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بچے سے متعلقین حضرات کو یہ بات کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بچہ ہر حال میں بچہ ہی رہتا ہے۔ اسے بچہ جان کر ہی اس سے تمام توقعات وابستہ کرنا چاہئیں۔ اس کے سوچنے اور کام کرنے کا معیار اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اسے بڑوں کے معیار تک پہنچنے میں بہت وقت لگے گا۔ مثلاً

ایک ماں اپنے بچے سے پیار محبت کے ساتھ کمرہ صاف کرنے کو کہتی ہے۔ بچہ کمرے کی صفائی کرتا ہے لیکن صفائی کا معیار اس کی ماں کے معیار کے مطابق نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ماں کا فرض ہے کہ بچے نے جتنا کام کیا ہے اس کو دیکھ کر کام کی تعریف کی جائے اور کام کے ذریعے بچے کی ہمت افزائی کی جائے۔ مزید صفائی کے لیے اسے اپنے ساتھ لگایا جائے۔ اس طرح کمرہ بھی صاف ہو جائے گا۔ اور بچہ صفائی کے کام سے خوش ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ کہ بچہ اپنی ماں کے معیار کے مطابق کمرے کو صاف کرنا سیکھ لے گا۔ یاد رہے کہ بچے کو جو ذمے داری دی جائے اسے پورا کرایا جائے۔ کام پر تنقید کرنے یا محض نقائص نکالنے کی بجائے جو کام جتنا کیا جائے اس کی مناسب انداز میں تعریف کی جائے۔ اس طرح کام کرنے والے کی ہمت افزائی ہوگی۔ کام کے دوران بچے کو مناسب توجہ، محبت اور مقبولیت ملتی رہنی چاہیے۔ اس طرح بچے کو اچھی اور پسندیدہ عادتیں پیدا کرنے کا شوق ہوگا۔ یاد رہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور صبر و تحمل اور حسن سلوک سے کام لینا چاہیے۔

مقابلہ :

ڈسپلن کی تربیت میں مقابلہ کرنے کا طریقہ زیادہ مفید نہیں ثابت ہوتا۔ مقابلہ کرنے والا صرف کامیاب ہونے پر خوش ہوتا ہے لیکن وہ شخص جو مقابلے کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اپنا کام اچھی طرح انجام دینے کی کوشش کرتا ہے ہر وقت اور ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ مقابلے کی عادت دوست بنانے میں کم اور دشمن بنانے میں زیادہ کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

ہمیں اپنے اسکولوں بالخصوص ابتدائی تعلیم کے اسکولوں میں انفرادی مقابلہ نہیں کرانا چاہیے۔ اکثر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے ثابت ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں مقابلے کے بغیر زندگی کو کامیاب بنانا مشکل ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مقابلے کی وجہ سے بچے میں کیا کمزوریاں اور خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ امتحان میں اول آنے یا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمبر حاصل کر کے انعام حاصل کرنے کا جذبہ جماعتی زندگی میں بدمزگی پیدا کر دیتا ہے۔ مقابلے کی وجہ سے جماعت میں دو گروپ بن جاتے ہیں۔ ایک طرف اچھے نمبر حاصل کرنے والے ہوتے ہیں اور دوسری طرف کم نمبر پانے والے۔ اچھے نمبر حاصل کرنے والے طلبہ تعداد میں کم

ہوتے ہیں اور کم نمبر پانے والے زیادہ۔ زیادہ نمبر پانے والے طلبہ کی جماعت یا گروپ دوسرے گروپ کے طلبہ کو اپنے سے کم تر سمجھنے لگتا ہے اور کم نمبر پانے والے طلبہ کا گروپ اپنے مقابل گروپ سے بد ظن ہو کر الگ تھلگ رہنے لگتا ہے۔

انفرادی مقابلے کی وجہ سے اسکول میں تعاون اور اشتراکِ عمل کی کمی رہتی ہے۔ طلبہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔ وہ کسی کی انفرادیت اور صلاحیت کا احترام نہیں کرتے۔ ان کے دلوں میں بغض اور کدورت پائی جاتی ہے۔ عام طور سے ان میں خود اعتمادی نہیں پیدا ہوتی۔ وہ خود کو بالکل بے کار اور ناکارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اچھے نمبر پانے والے طلبہ میں عام طور سے دوسروں کو شکست دے کر آگے بڑھنے یا خود کو سب سے اچھا ثابت کرنے کی خواہش رہتی ہے۔ وہ خود غرض ہوتے ہیں اور خود کو سماجی فلاح و بہبود کے کاموں سے الگ رکھتے ہیں۔

انفرادی مقابلے سے صرف ایسے چند طلبہ کو فائدہ ہوتا ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کے ہوتے ہیں۔ ورنہ انفرادی مقابلے کا طریقہ زیادہ تر طلبہ کے لیے ہمت شکن ثابت ہوتا ہے۔ اور ان میں سیکھنے کا شوق کم ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ غیر سماجی کاموں میں شریک ہو کر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

جب کسی طالب علم میں مقابلے کی خواہش پیدا کرائی جاتی ہے تو وہ اپنی توانائی کو کامیابی یا ناکامی کو سوچنے میں صرف کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے کام کی طرف بہت کم متوجہ ہوتا ہے۔ مقابلے کا شوقین طالب علم صرف کامیابی کی حد تک مطمئن اور خوش رہتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں وہ خود کو کم اور دوسروں کو زیادہ موردِ الزام قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو جائز طریقہ سے استعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ مقابلے کے عادی طلبہ بے چین رہتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ ملنے اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ذہنی سکون اور دل کا اطمینان اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جسے مقابلے کی عادت نہیں ہوتی۔ اسے یہ فکر نہیں رہتی کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں یا کیا کہیں گے۔ وہ تو صرف اپنا کام بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دینے کی فکر کرتا ہے۔ وہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ کام کا سب سے بڑا انعام خود کام ہوتا ہے۔ وہ اپنے رفقائے کار اور عزیزوں کو اپنا مقابل نہیں بلکہ عزیز سمجھ کر ان سے ملتا جلتا ہے اور خوش رہتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور سکون ہوتا ہے۔ وہ خود کو نہ تو احساسِ کمتری کا شکار بننے دیتا ہے اور نہ ہی احساسِ برتری میں مبتلا کرتا ہے۔ اسے نہ

تو کسی کی تعریف کی خواہش ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی سے بلاوجہ بد ظن ہوتا ہے۔ اس میں عزت نفس کا مادّہ ہوتا ہے اور وہ دوسروں کی بھی دل سے عزت کرتا ہے اور باہمی محبت اور اشتراک عمل کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ مقابلے کے ذریعہ کوئی بھی استاد بچے کو صحیح معنوں میں سیکھنے کا شوق نہیں دلا سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو استاد بچے کو محبت اور عزت کے ساتھ اپنا لیتے ہیں وہ اس میں لکھنے پڑھنے اور سیکھنے کا شوق پیدا کرا سکتے ہیں۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ اکثر والدین اپنے بچوں میں شروع ہی سے مقابلے کا شوق پیدا کرا دیتے ہیں۔ ان میں تعاون اور اشتراک عمل کے بجائے الگ تھلگ رہنے اور مقابلہ کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ رائج طریقہ تدریس کی وجہ سے ان کے شوق اور خواہش میں اور زیادہ اضافہ اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر یہی شوق بچے کے لیے بد قسمتی اور تکلیف کا سبب بن جاتا ہے۔ جو بچہ مسلسل دوسروں کو شکست دینے یا دوسروں سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمیشہ پریشان اور بے چین رہتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں وہ مقابلہ کرنا چھوڑ دیتا ہے اور امتحان کے دنوں میں جذباتی انتشار کی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہے۔ مقابلے کے عادی بچے کو دوسروں کی مدد کرنے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی مطلق فکر نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف اپنے مفاد کے لیے کام کرنا پسند کرتا ہے۔ اچھا استاد جماعت کو ایک خاندان سمجھ کر اس کے ہر فرد کو یکساں محبت' توجہ اور قبولیت دیتا ہے۔ وہ بچوں میں مساوات' باہمی محبت اور اشتراکِ عمل کا شوق پیدا کراتا ہے۔ اس کی جماعت کے بچے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر باہمی تعاون سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے بہت سے بچے دیکھے ہیں جو اپنے ہم سبقوں کی محبت اور مدد سے آگے بڑھے ہیں۔ کمزور بچوں کو ساتھیوں کی مدد اور استاد کی ہمت افزائی اور رہنمائی سے اپنی کمزوریوں کو دور کرنے اور ترقی کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ماں باپ اور استاد کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بچہ فطرتاً آزاد ہوتا ہے۔ اس کی آزادی میں بے جا مداخلت اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کے اجاگر ہونے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ تعلیم پانا اس کا پیدائیشی حق ہے۔ کھیلنا کودنا' ہنسنا بولنا خیالی پلاؤ پکانا' محبت کرنا اور اپنے وجود کو باقی رکھنا بھی اس کی فطرت کا اہم جزو ہیں۔ ہر بچہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے ساتھ ہر صورتِ حال میں شرافت اور انسانیت کا سلوک کیا جائے۔ جن بچوں کی ڈسپلن کی تعلیم و

تربیت مقابلے کے بجائے ان کی فطرت اور ذاتی دلچسپیوں کے مطابق ہوتی ہے وہ یقیناً زیادہ محنتی، ایمان دار، فرض شناس، بلند حوصلہ، باہمت اور حقیقت پسند ہوتے ہیں اور وہ آگے چل کر ایسے ذمہ دار شہری بنتے ہیں جن کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اطمینان اور سکون رہتا ہے۔

نتیجے سے زیادہ کوشش کا اعتراف :

کسی کام کی تعریف کرتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کام کے نتیجے کے مقابلے میں کام کرنے والے کی محنت، کوشش اور دلچسپی کا ذکر کیا جائے بالخصوص نو عمر اور نو خیز بچوں کے ساتھ ضروری نہیں کہ کام پورا ہونے کے بعد ہی تعریف کی جائے۔ کام پورا ہونے یا کام کا نتیجہ دیکھنے کے بعد جو تعریف کی جاتی ہے وہ تعریف انعام کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو بظاہر رشوت بن جاتی ہے۔ کام کے دوران اس کے طریقۂ کار اور شوق کی تعریف کرنے سے کام کرنے والے کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کام خود اپنا انعام ہوتا ہے اور اس میں کام کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ اس کام کو پورا کر سکتا ہے۔ جو بچہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس میں کام کرنے کی صلاحیت ہے تو اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور اپنے کام کو بہتر سے بہتر طریقے پر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کام کے دوران بچے کی تعریف کرنے اور ہمت افزائی کرنے سے ایسا ہی فائدہ ہوتا ہے جیسا کسی پودے کو پروان چڑھنے میں دھوپ اور پانی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کام کے دوران بچے کی کوشش اور لگن کو مناسب طریقے سے سراہا جائے تاکہ وہ شکستہ دل اور کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے اولوالعزم اور باہمت بن سکے۔

خاموشی اور درگزر :

خاموشی اور درگزر سے مراد یہ ہے کہ بچوں کی معمولی معمولی شرارتوں کو نظر انداز کیا جائے۔ تھوڑی عمر کے بھائی بہن بسا اوقات والدین کی توجہ حاصل کرنے کی غرض سے شرارتیں کرتے ہیں۔ ان کی شرارتوں کو دیکھ کر جو ماں باپ یا استاد خفا ہو کر چیخنے چلانے لگتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ غصہ میں جو بات کہی جاتی ہے اس کا بچوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بہتر یہ ہے کہ وقتی طور پر بچوں کی شرارت کو نظر انداز کیا جائے اور جب وہ اپنا لڑنا جھگڑنا اور رونا دھونا بند کر دیں تب نہایت محبت اور اطمینان کے ساتھ جو کچھ سمجھانا ہو وہ سمجھایا جائے۔ محبت

کرنے سے بچہ سیکھنے پر آمادہ ہوتا ہے اور چیخنے چلانے اور خفا ہونے سے آپس میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

سنجیدہ قسم کی شرارت یا بداخلاقی کے موقع پر خاموشی اور درگذر سے بعض اوقات بچے کو ناقابلِ تلافی یا ناقابلِ برداشت نقصان ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے مثلاً بارہ تیرہ برس کا ندیم اپنے ابّو کی اجازت کے بغیر ان کا اسکوٹر لے جاتا ہے اور تھوڑی دور جانے کے بعد کسی درخت سے ٹکرا کر اسکوٹر کا مڈگارڈ ٹوٹ جاتا ہے اور ندیم کے بھی چوٹ لگ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ندیم کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے اس کے بعد ندیم کی غلطی کو اس طرح سمجھایا جائے کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کر سکے۔

ہمت افزائی :

جس طرح پودے کو خوب سے پروان چڑھنے کے لیے ہوا، پانی اور روشنی کے علاوہ سمجھ دار مالی کی نگرانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح شخصیت کی صحیح نشوونما کے لیے منجملہ اور چند چیزوں کے ڈسپلن کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ڈسپلن کی تربیت میں ہمت افزائی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ جن بچوں کو ہمت افزائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہی اس سے محروم رہتے ہیں۔

ہمت افزائی سے محروم بچے عام طور سے شرمیلے، بزدل اور پست ہمت ہوتے ہیں۔ ان میں تکلیفوں کو برداشت کرنے اور مشکلوں کو آسان بنا لینے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے سہارے جینا پسند کرتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ گھر اور اسکول دونوں جگہ بچے کی ہر وقت مناسب طریقے سے ہمت افزائی کرنا چاہیے۔ اسے آزادی کے ساتھ سوچ سمجھ کر آگے بڑھنے کے مواقع ملنا چاہئیں تاکہ اس میں خود اعتمادی، خود شناسی اور عزتِ نفس جیسی خوبیاں پیدا ہو سکیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے یہاں کتنے لوگوں کو اتنی فرصت اور اتنا سلیقہ ہوتا ہے کہ صحیح طریقے سے ہمت افزائی کر سکیں۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ قسمت کا لکھا مٹتا نہیں۔ جس کو جو بننا ہوتا ہے وہ بن جاتا ہے۔ اس بات میں کچھ وزن ضرور ہے۔ اس لیے کہ نشوونما کا عمل فطری ہے۔ جس طرح دوب گھاس سخت سے سخت زمین کا پیٹ چیر کر باہر نکل آتی ہے یا پہاڑی زمین میں

پھول دار پودے اگ آتے ہیں اسی طرح چند ہونہار اور سخت جان بچے ناموزوں اور ناساز گار ماحول کے باوجود اپنی فطری صلاحیتوں کو فروغ دے کر اچھے ادیب' اچھے فن کار' اچھے وکیل اور سمجھ دار سماجی انسان بن جاتے ہیں لیکن تعلیم و تربیت تو ہر بچے کا پیدائشی حق ہے اس لیے سب کی مناسب تربیت کے لیے رہنمائی اور ہمت افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمت افزائی کرنا بھی ایک فن ہے۔ دوسروں کو اپنانے' دوسروں کی دلجوئی کرنے' دوسروں میں خودداری' خودشناسی' خود اعتمادی اور عزتِ نفس جیسی خوبیاں پیدا کرانے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔ ہمت افزائی کے لیے شرط اول یہ ہے کہ بچہ جیسا بھی ہو اسے غیر مشروط طریقے پر اپنایا جائے۔ اس کی خرابیوں اور کمزوریوں پر تنقید نہ کی جائے۔ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کی تعریف کی جائے۔ ہمت افزائی کا مطلب ہے بچے کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچان کر اُنھیں فروغ دینا۔ اس کام کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو آزادی دی جائے۔ اس سے چھوٹے موٹے کام ضرور کرائے جائیں۔ شروع میں کام عام معیار کے مطابق نہ ہوگا لیکن اسے رفتہ رفتہ کام کو ذمہ داری کے ساتھ بہتر طریقے پر کرنا آئے گا۔ اگر بچے کے کام کرنے سے گھر کی کوئی چیز خراب ہوتی ہے تو ہو جانے دیجیے۔ چیز خراب ہونے سے بچہ تو خراب نہیں ہوگا۔ اسے کام کرنا آئے گا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوگا۔

بعض والدین اور اساتذہ ہمت افزائی اور تعریف میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ وہ تعریف کو ہمت افزائی کا ذریعہ سمجھ کر اس بری طرح تعریف کرتے ہیں کہ بچے کو انعام حاصل کرنے کی تمنا ہو جاتی ہے جو سراسر غلط ہے۔ بچے کی تحصیلات اور کامیابیوں پر حتی الامکان خوشی کا اظہار کیا جائے اور مناسب طور پر تعریف بھی کی جائے۔ یاد رہے کہ تعریف کام کی ہونی چاہیے۔ مثلاً یہ کہنا غلط ہوگا کہ یوسف میاں تم بہت اچھے ہو۔ تم اپنی جماعت کے اچھے لڑکے ہو۔ یہ تو دراصل اخلاقی فیصلہ ہوا۔ بچہ بذات خود نہ اچھا ہوتا ہے اور نہ برا۔ وہ جو کام کرتا ہے وہ اچھا یا برا ہوتا ہے اور وہ کام ہی اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یوسف میاں تم نے اپنی جماعت میں جو کچھ کیا وہ ہمیں پسند آیا۔ شاباش۔ تم محنت کرتے ہو۔ آج کا کام تو تمہارے کل کے کام سے بھی اچھا معلوم ہو رہا ہے اس طرح کام کی تعریف کرنی چاہیے نہ کہ کام کرنے والے کی۔ کام کی تعریف کرنے سے بچے کی خود بخود ہمت افزائی ہوتی ہے اور اسے ترقی کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اگر کام کے دوران کام کرنے والے کی محنت اور شوق کی تعریف

کی جاتی ہے تو اس سے بچے کو وہی فائدہ ہوتا ہے جو پودے کو پروان چڑھنے کے لیے مالی کی نگہداشت سے ہوتا ہے۔ ہمت افزائی کے لیے ضروری ہے کہ :

۱۔ بچے کی ہمت شکنی نہ کی جائے۔ اس سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے جو بہت بری بلا ہے۔

۲۔ کام کو صحیح طریقے سے کرنے کا شوق دلایا جائے نہ کہ اس میں کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔

۳۔ کام کے نتیجے کے ساتھ ساتھ کام کرنے والے کی محنت اور کوشش کی بھی تعریف کی جائے۔

۴۔ کام کی خرابیوں کو دیکھ کر کام کرنے والے کو برا نہ کہا جائے بلکہ خرابیوں کو دور کرنے کا طریقہ سمجھایا جائے۔

۵۔ کام کی تعریف کر کے کام کرنے والے کی ہمت افزائی کی جائے۔

۶۔ کام کے دوران بچے پر پورے طور سے بھروسا کیا جائے۔ بچے پر بھروسا کرنے سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ غلطیوں کی وجہ سے بچے کو ناکامی کا احساس نہ دلایا جائے بلکہ ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ بنایا جائے۔

۸۔ بچے کو خود اس کی سیکھنے کی رفتار کے مطابق آگے بڑھنے کا شوق دلایا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں کی مثال دے کر آگے بڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ سب بچے یکساں رفتار سے نہیں سیکھتے ہیں۔

۹۔ بچے کو زیادہ سے زیادہ خود کفیل بننے کا شوق دلایا جائے۔

۱۰۔ انفرادی مقابلہ نہ کرایا جائے انفرادی مقابلے کی وجہ سے بچہ عام طور سے پست ہمت اور بزدل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ خود غرض اور خود پسند بن جاتا ہے۔

۱۱۔ محنت اور مسلسل کوشش کا نتیجہ کامیابی ہوتا ہے۔ بتایا جائے کہ کامیابی دراصل مدت اور شدت کا حاصل ضرب ہوتی ہے۔

۱۲۔ اسکول کے مختلف کاموں کی ذمہ داریاں، صرف ان ہی طلبہ کو نہ دی جائیں جو ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں بلکہ جو بچہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو اسے بھی ذمہ داری دی جائے۔ اس

طرح اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی اور اس کی ہمت افزائی ہو گی۔

۱۳۔ پست ہمت اور مایوس بچے کو ایسے بچوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس کی مدد کر سکیں۔

۱۴۔ یاد رہے کہ مایوسی اور پست ہمتی چھوت کی بیماری ہے۔ والدین اور اساتذہ کو سدا پُر امید اور بلند ہمت ہو کر بچوں کے ساتھ کام کرنا چاہیے اور ان سے کبھی ناخوش نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی خوشی سے بچے خوش رہیں گے۔

۱۵۔ کسی ایک کی تسلی اور ہمت افزئی کے لیے دوسروں کو برا نہ کہا جائے اور نہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس کی وجہ سے کسی اور میں احساس کمتری پیدا ہو۔

ہمت افزائی ایک نفسیاتی عمل ہے یا یوں کہیے کہ یہ نفسیاتی اصولوں کا ایسا استعمال ہے جس کے ذریعے ڈسپلن کی ترتیب میں مدد ملتی ہے۔ بعض اوقات ان اصولوں کے غلط استعمال سے بچوں کی بری طرح ہمت شکنی ہو جاتی ہے۔ درج ذیل چند مثالوں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کی کس کس طرح ہمت شکنی کی جاتی ہے :

''اماں جان کو کسی دعوت میں جانے کی جلدی تھی۔ بیٹا جس کی عمر تقریبا پانچ سال تھی اپنے دوسرے پانو کے جوتے کے فیتے کس کر باندھ رہا تھا۔ اماں جان اس کے سر پر آکر سوار ہو گئیں اور کہنے لگیں۔ ارشد جلدی کرو جلدی۔ دیر ہو گئی ہے۔ ابھی ارشد یہ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ باندھ رہا ہوں۔ ''اماں جان'' نے غصہ میں آکر اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور کرسی پر بٹھا کر جوتے کا فیتہ کس کر باندھ دیا اور جلدی سے گود میں اٹھا کر دعوت کے لیے روانہ ہو گئیں۔''

ظاہر ہے ارشد کو اپنی نااہلی اور ناکامی کا احساس ہوا ہو گا اور سمجھا ہو گا کہ اماں زیادہ تیز اور ہوشیار ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھا ہو گا کہ اگر اسے کسی کام کو کرنے میں دیر لگے گی تو اماں جان اس کام کو جلدی سے پورا کر دیں گی۔ بعض والدین بچوں سے کام کرانا چاہتے ہیں لیکن وہ کام جو ان کی مرضی کے مطابق ہوں۔ وہ بچوں کے شوق اور دلچسپی کی پروا نہیں کرتے۔

پانچ برس کی عائشہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں کام کرنا چاہتی ہے۔ وہ گھر کی کھڑکیوں کے شیشے اور کھانے کی میز صاف کرنا چاہتی ہے اور اپنی بساط کے مطابق انھیں صاف کرتی ہے۔ عائشہ کی والدہ اس کے کام کو دیکھ کر کہتی ہیں ''عائشہ تم تو میرا کام بڑھا رہی ہو'' اور یہ کہتی ہوئی میز اور شیشوں کو دوبارہ صاف کرتی ہیں ۔ اسی دوران عائشہ دیواروں پر صابن کا پانی پھینک

دیتی ہے تاکہ دیواروں پر پڑے دھبے صاف کیے جاسکیں۔ یہ دیکھ کر عائشہ کی والدہ اور زیادہ خفا ہو جاتی ہیں اور صابن کا پانی بھری پچکاری چھین کر عائشہ کے ہاتھ پر ایک چپت رسید کر دیتی ہیں اور عائشہ خاموش کھڑی رہ جاتی ہے۔

جو والدین یا اساتذہ بچوں کی صلاحیت اور قوت کا اندازہ کیے بغیر ان پر برس پڑتے ہیں اور ہر کام اپنے معیار کے مطابق کرانا چاہتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچہ کمزور اور بے سہارا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی مدد اور سہارا چاہتا ہے۔ ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہوتا ہے۔ دوسروں کی رہنمائی چاہتا ہے۔ انھیں کام کرنے ہی سے کام کا تجربہ اور سمجھ حاصل ہوتی ہے۔ ہمت افزائی کے اصولوں کے مطابق والدین اور اساتذہ پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ بچوں کو آزادی دی جائے۔ ان سے گھر اور اسکول میں کام کرایا جائے۔ شروع میں کام کا معیار اچھا نہ ہوگا لیکن رفتہ رفتہ کام کو بہتر طریقے پر کرنا آئے گا۔ اگر بچے کے کام کرنے سے گھر یا اسکول کی کوئی چیز مثلاً دیواریں اور فرنیچر وغیرہ خراب ہوتا ہے تو ہونے دیا جائے۔ چیزوں کے خراب ہونے سے بچہ تو خراب نہیں ہوگا۔ اسے کام کرنا آئے گا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ اسے رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ پیر ہلا کر دوسروں کی مدد کرنے کا شوق ہوگا۔

لازمی نتائج پر مبنی طریقہ :

ہمت افزائی اور لازمی نتائج پر مبنی طریقہ۔ ان دونوں طریقوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے سے ڈسپلن کی تربیت میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے۔ ان دونوں طریقوں کو انعام اور سزا کے طریقوں کا نعم البدل مانا جاتا ہے۔ انعام اور سزا کے طریقہ کا استعمال مطلق العنان حکمرانوں کے دور میں خوب ہوا۔ جمہوری دورِ حکومت میں اس طریقے کے بجائے نتائج پر مبنی طریقے کو رواج دینے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ بچوں کو داخلی ڈسپلن سیکھنے میں مدد مل سکے۔

لازمی نتائج پر مبنی طریقہ دراصل نفسیاتی اصولوں اور سماجی ضرورتوں کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ تقریباً سو سوا سو پرانا ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس کا استعمال عام نہیں ہوا ہے۔ یہ طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ کوئی شخص اپنی خوشی سے ایسا کام نہیں کرتا ہے جو اس کے لیے مفید نہ ہو۔ یوں تو بہت سے لوگ روزانہ زندگی میں ایسے بہت سے کام کر گزرتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں کام شروع کرنے سے

پہلے یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ وہ کام مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ کوئی بچہ خود کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ مثلاً اگر کوئی بچہ اپنا سر میز پر مارتا ہے اور اس کے سر میں چوٹ لگ جاتی ہے تو وہ اپنا سر دوبارہ میز پر نہیں مارے گا۔ یا جلتے توے پر ہاتھ لگانے سے ایک مرتبہ ہاتھ جل جانے کے بعد دوبارہ گرم توے کو چھونے کی کوشش نہیں کرے گا اور اپنے اس تجربے کو عمر بھر یاد رکھے گا۔

لازمی نتائج پر مبنی طریقے کے استعمال میں نہایت صبر و تحمل اور حسنِ سلوک سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس میں بچوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام کے نتیجے کو دیکھیں اور سمجھیں انھیں بچوں کے ہر کام پر تبصرہ کرنا ہوتا ہے مثلاً :

ہمارے ایک دوست کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک تقریباً ۱۲ برس کی ہے اور دوسری ۱۴ برس کی' ماں باپ اور بیٹیوں نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ دونوں بچیاں مل کر کھانے کی میز پر برتن لگائیں گی اور کھانے کی پلیٹوں اور کچن کی صفائی بھی یہ دونوں بہنیں ہی کریں گی۔ ایک روز دونوں بہنیں اسکول سے واپس آکر کھانے کے کمرے میں گئیں اور کھانا کھا کر استعمال شدہ پلیٹوں اور گلاسوں کو میز پر رکھا چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا کر سو گئیں۔ ان کی امی نے میز کو اور کچن کو گندی حالت میں دیکھ کر اپنے غصہ پر قابو پایا اور شام کا کھانا پکانے کے بعد حسب معمول اعلان کیا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ میز پر کھانے کے برتن لگا دیے جائیں۔ لڑکیوں نے گندی پلیٹوں کو کچن میں رکھا اور الماری میں سے دوسری پلیٹیں اور گلاس نکال کر ترتیب سے میز پر رکھ دیے۔ سب کھانا کھا کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ استعمال شدہ پلیٹیں اور گلاس میز پر رکھے رہ گئے۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی کی وجہ سے لڑکیاں صبح دیر تک سوتی رہیں۔ ان کی والدہ حسبِ معمول وقت پر اٹھیں اپنے اور اپنے میاں کے لیے ناشتہ بنایا اور ناشتے کے بعد کہیں باہر چلی گئیں۔ جب لڑکیاں انھیں تو دیکھا کہ کچن گندہ پڑا ہے اور کل دوپہر کے گندے برتنوں سے کچھ بدبو آرہی ہے۔ دونوں بہنوں نے ناک بھوں چڑھا کر جیسے تیسے گندے برتنوں کو دھویا اور کچن کو صاف کیا' اس کے بعد دونوں نے خود ہی یہ طے کیا کہ آیندہ کبھی بھی کھانے کے بعد برتنوں کو بغیر دھلا نہیں چھوڑا جائے گا۔ انھیں کچن کی گندگی کو دیکھ کر خود ہی محسوس ہوا کہ کھانے کے فوراً بعد استعمال شدہ برتنوں کو بغیر دُھلا چھوڑ دینے سے کچن میں تافن پیدا ہو جاتا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد برتنوں کو دھونے میں وہ تکلیف نہیں ہوتی جو

گندے برتنوں کو بعد میں دھونے سے ہوتی ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خارجی دباؤ اور حکم کے ذریعے کام کرانے سے بچہ اتنا نہیں سیکھ پاتا جتنا اپنی مرضی اور شوق سے سیکھتا ہے۔ ہمارے دوست کی بیوی نے صبر و تحمل سے کام لے کر اپنی بچیوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بھی سکھایا کہ کام کو وقت پر پورا کر لینے میں جو مزہ آتا ہے وہ بے وقت کام کرنے سے نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی لڑکیوں کو یہ بھی سکھایا کہ جو ذمہ داری دی جائے اسے بحسن و خوبی وقت پر پورا کرنا چاہیے۔

والدین کے لیے چند ضروری ہدایات

ڈسپلن کا مقصد واضح کرنے اور اس کے معیار اور ضابطوں کو بتانے کے بعد یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ والدین کو کس وقت محبت اور پیار سے کام لینا چاہیے اور کب تھوڑی بے رخی اختیار کرنی چاہیے۔

ابھی تک کوئی ایسا طریقہ نہیں معلوم ہو سکا جسے محبت اور بے رخی کے بیچ کا راستہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ڈسپلن کی تربیت کے لیے والدین کو خود ہی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کب محبت سے کام لیا جائے اور کب تھوڑی بے رخی اور عدم توجہی برتی جائے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ والدین کو وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس کے ذریعہ بچے کو سماجی اور جذباتی اعتبار سے اچھا انسان بننے میں مدد مل سکے۔

بچہ فطرتاً آزاد ہوتا ہے۔ وہ آزاد ماحول میں خوش رہتا ہے۔ شروع شروع میں اس کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگانا مناسب نہیں۔ یوں بھی وہ اپنی عمر کے پہلے سال میں ہر اعتبار سے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ عمر کے پہلے پانچ چھ مہینے تک تو اُس میں اتنی بھی سکت نہیں ہوتی کہ وہ خود سے بیٹھ بھی سکے۔ اس کی بے بسی اور کمزوری کو دیکھ کر ہی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جب روئے تو فوراً گود میں لے لینا چاہیے۔ جب دودھ پلانے کا وقت آئے تو فوراً دودھ پلا دینا چاہیے۔ غرض یہ کہ بچے کی احتیاجات کو فوراً پورا کرنا ہوتا ہے۔ فوری توجہ اور محبت کی وجہ سے بچے میں دوسروں پر بھروسا کرنے اور خود کو محفوظ سمجھنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

بچے کی احتیاجات کو پورا کرنے میں کبھی کبھار دیر ہو جانے سے اس کی شخصیت کی نشوونما پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا ہے لیکن اگر ایسا اکثر ہوتا ہے کہ بچے کو رونے پر گود میں نہیں لیا جاتا یا دودھ پلانے کے اوقات پر دودھ نہیں پلایا جاتا ہے تو اس کی قوتِ برداشت کمزور ہو جاتی ہے اور اس کے اندر جذباتی کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے۔ بچے کو جذباتی اور سماجی اعتبار سے اچھا انسان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو مجبوری اور محرومی کے احساس سے بچایا جائے۔

عمر کے دوسرے سال میں بچہ پہلے سال کی طرح دوسروں کی مدد اور سہارے کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ اب وہ خود سے بیٹھنا سیکھ لیتا ہے۔ چیزوں کو پکڑ کر کھڑا ہونے لگتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ چلنا بھی سیکھ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کے علاوہ دوسروں کو بھی پہچاننے لگتا ہے اور اپنے اردگرد رکھی چیزوں کو بھی جاننے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اس کوشش میں اس کی بعض سرگرمیاں ماں باپ کے لیے تکلیف دہ بن جاتی ہیں۔ تکلیف دہ حرکتوں سے روکنے پر اسے تکلیف ہوتی ہے۔ بالآخر وہ اپنی بات منوانے کے لیے رونا دھونا اور ضد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ڈسپلن کی تربیت کے لیے بچے کے رونے دھونے اور خفا ہونے کی پروا کیے بغیر اسے غلط حرکتوں سے روکنا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ اسے دوسروں کے آرام اور چیزوں کی حفاظت کا خیال ہو سکے۔ اس عمر میں بچے کو وہ آزادی نہیں دی جا سکتی جو اسے پہلے سال میں حاصل تھی۔

عمر کے پہلے دو سال کا دور شیر خوارگی یا طفولیت کا ہوتا ہے۔ اس دور کے بعد بچپن پھر نوبالغی اور اس کے بعد بالغی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں والدین اور اساتذہ کو خود ہی سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ بچے کو کب بالکل آزاد چھوڑا جائے اور کب اس پر نگرانی رکھی جائے۔ کب محبت کی جائے اور کب تھوڑی بے رخی اختیار کی جائے یا کب اس کو من مانے کام کرنے دیے جائیں اور کب من مانے کاموں سے روکا جائے۔ اس طرح کا صحیح فیصلہ بچے کے حق میں مفید ثابت ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی اچھا ثابت ہوتا ہے

شیر خوارگی یا طفولیت کے دور کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اس میں شروع سے آخر تک آزادی اور نگرانی دونوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ہم پہلے والدین کے لیے اور پھر اساتذہ کے لیے ضروری ہدایات کا ذکر کریں گے۔ والدین کو گھر میں بچے کی تربیت کے لیے اس کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتے وقت بڑی سوجھ بوجھ اور احتیاط سے کام کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً :

کھانا پینا

ضرورتوں کے ضمن میں سب سے پہلے بھوک کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ اگر بھوک کی احتیاج کو مناسب طریقے سے پورا کر دیا جاتا ہے اور بچے کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اسے بھوک لگنے پر کھانا مل جائے گا تو سمجھیے کہ اسے دوسروں کے ساتھ سماجی اور جذباتی اعتبار سے زندگی بسر

کرنے کا اچھا سبق مل رہا ہے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں صرف یہی کافی نہیں کہ اسے بھوک لگنے پر دودھ پلا دیا جائے یا کچھ کھلا دیا جائے بلکہ زیادہ ضروری یہ ہے کہ جو کچھ کھلایا پلایا جائے' انتہائی محبت اور احتیاط کے ساتھ کھلایا پلایا جائے تاکہ اسے محبت اور اپنی حفاظت کی طرف سے اطمینان رہے۔ اس اطمینان کا بچے کی جسمانی اور جذباتی نشوونما پر اچھا اثر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے والدین اور سرپرستوں کو بھی آرام اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ڈرا دھمکا کر یا سختی کے ساتھ ماں کا دودھ چھڑا دینے سے یا کھانے کی میز پر بیٹھ کر باقاعدہ کھانا کھانے یا ٹھوس کھانا کھانے پر مجبور کرنے سے بچہ جذباتی انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ طرح طرح سے گھر والوں کو پریشان کرنے لگتا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنا دودھ چھڑاتے وقت محبت اور اطمینان کے ساتھ بچے کو شیشی سے دودھ پینا سکھایا جائے۔ جب بچہ کھانا کھانے کے قابل ہو جائے تو اسے پہلے کھانا کھلا دیا جائے اور پھر گھر کے دوسرے اراکین آرام سے کھانا کھائیں۔ احتیاطاً کوئی ہلکی پھلکی کھانے کی چیز دے کر اسے اپنے ساتھ ضرور بٹھالیا جائے تاکہ اسے اپنے نظر انداز کیے جانے کا احساس نہ ہو اور وہ یہ دیکھ سکے کہ میز پر یا دستر خوان پر کھانے کی کیا کیا چیزیں ہیں اور وہ کس طرح کھائی جاتی ہیں۔

بڑی عمر کے بچے کو اس کی اپنی کرسی پر بٹھا کر اس کے سامنے کھانا کھایا جائے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ بڑے لوگ کس طرح چبا چبا کر آرام اور اطمینان سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے مشاہدے کی مدد سے کھانے کے آداب سے بھی واقف ہو گا۔ بعض اوقات بچے جذباتی انتشار کے باعث کئی طرح کے مسئلے پیدا کرتے ہیں مثلاً کھانا کھانے سے انکار کرنا۔ کھانا کھانے میں ضرورت سے کہیں زیادہ وقت لگانا' بھوک سے کہیں زیادہ کھانا یا غیر ضروری تکلف اور بناوٹ کے ساتھ کھانا کھانا وغیرہ اس قسم کے مسئلوں سے یہ سمجھنا چاہیے کہ بچہ محبت کا بھوکا ہے۔ مقبولیت چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ سمجھ دار والدین بچے سے محبت اور مروت بھی کرتے ہیں' اسے اپنے سے دور نہیں کرتے اور اس کی طرف خوب متوجہ ہوتے ہیں۔

پیشاب پاخانہ :

بچہ اپنی فطرت اور معصومیت کی وجہ سے اپنے پیشاب اور پاخانہ کو کوئی گندی چیز نہیں سمجھتا وہ اس سے کھیل کر خوش ہوتا ہے۔ بعض بچے تو اپنی انگلیوں پر پاخانہ لگا کر انھیں چاٹنے

لگتے ہیں۔ وہ اپنے پاخانہ سے کھیلنے میں کسی قسم کی گھن نہیں محسوس کرتے۔ شیر خوارگی اور بچپن کے دور میں بچے کے ذہن میں پاکی اور ناپاکی کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے۔ ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ شروع ہی سے بچوں میں صاف ستھرا رہنے اور پاک صاف رہنے کی عادت پیدا کرائیں دھیرے دھیرے غسل اور استنجے کے آداب سکھائیں لیکن ان آداب کے سکھانے اور صفائی اور پاکی کی عادت پیدا کرنے کے لیے انھیں اتنا مجبور نہ کیا جائے کہ وہ جذباتی اعتبار سے پریشان رہنے لگیں۔ ماں باپ کا فرض ہے کہ محبت اور شفقت کے ساتھ صفائی اور پاکی کا احساس پیدا کرائیں۔ بچوں کو وقت پر پیشاب پاخانہ کرنے کا عادی بنائیں۔ پیشاب پاخانہ سے فارغ ہو کر پیشاب پاخانہ کی جگہوں اور اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح دھونا سکھائیں۔ ماں باپ کو سمجھنا چاہیے کہ پیشاب پاخانہ پر قابو پانے کی عادت عام طور سے تین سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ جب ان میں خود کو صاف ستھرا رکھنے کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو وہ مقررہ وقت پر اور مقررہ جگہ جا کر پیشاب پاخانہ کرنے لگتے ہیں۔ ابتدائی عمر میں اگر کوئی بچہ اپنا بستر گندہ کرتا ہے یا اپنے کپڑے گندے کرتا ہے تو اسے کبھی بھی ڈرایا دھمکایا نہ جائے اور نہ ہی اسے کسی کے سامنے یا علاحدگی میں بد تمیز گندہ اور نالائق کہا جائے۔ ایسا کہنے سے اس کو جذباتی اعتبار سے تکلیف ہوتی ہے اور پھر وہ ماں باپ کو پریشان کرنے یا ان کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے سوتے سوتے بستر میں پیشاب کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ غلطی اور لغزش بڑوں سے بھی ہو جاتی ہے اور بچوں سے بھی۔ اگر گہری نیند، معدہ کی خرابی یا کسی سفر کی طوالت کی وجہ سے بچہ اپنے کپڑے گندے کر لیتا ہے تو اسے نکو نہ بنایا جائے۔ ہم نے ایسے کئی بچوں کی نگرانی کی ہے جو چھ سات برس کی عمر میں بھی سوتے ہوئے اپنا بستر گندہ کر لیتے تھے۔ ہم نے ان کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا اور ان کی رہنمائی بھی کی۔ بستر میں پیشاب کر لینے کی عادت کسی کو ماں باپ کی محبت اور توجہ نہ حاصل ہونے کے احساس سے ہوئی تھی اور کسی کو یہ بری عادت اس لیے ہوئی کہ ان کا کوئی چھوٹا بھائی یا بہن ان کی ماں سے ملنے والی محبت میں شریک ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے اسے اپنے ماں باپ کی محبت میں کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

گارے مٹّی سے کھیلنا :

پانچ چھ برس کی عمر تک بچے کو اپنی صفائی ستھرائی کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ وہ ریت، کیچڑ مٹی اور پانی سے کھیلنے میں بڑی خوشی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اسے ملائم اور چسکدار کھانے زیادہ پسند ہوتے ہیں۔ کسی بچے کو ریت یا کیچڑ میں کھیلنے سے روکنے یا ملائم اور چسکدار کھانا کھانے پر پابندی لگانے کا مطلب اس کی فطرت کو دبانے اور اسے فطرت کے خلاف چلانے کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مٹی اور ریت میں کھیلنے سے بچے کی جسمانی اور تخلیقی قوت میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے کھیلوں سے بچے کو آزاد اور نڈر زندگی بسر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ درحقیقت مٹی میں کھیلنا بچے کی فطرت میں شامل ہے۔

ڈسپلن کی تربیت کے پیشِ نظر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچے کو اس کی فطرت کے مطابق آزادی کے ساتھ کھیلنے کودنے کا موقع ضرور دیا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس پر نگرانی بھی رکھی جائے۔ یا یوں سمجھیے کہ اس کی آزادی پر تھوڑی پابندی ضرور لگائی جائے۔ ایسا کرنے سے بچے کو اپنی چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع بھی ملے گا اور اپنے من کی موجوں کو دبانے کی تربیت بھی حاصل ہوگی مثلاً گارے مٹّی سے ضرور کھیلنے دیا جائے لیکن یہ بتادیا جائے کہ گارے مٹّی کا کھیل گارے مٹّی کی جگہ یا ریت کا کھیل ریت کے گڑھے میں کھیلا جائے۔ یہ نہ ہو کہ سونے کے کمرے یا کھانے کی میز پر بیٹھ کر گارے مٹّی سے کھیلا جائے۔ رنگوں سے کاغذ پر تصویریں بنائی جائیں نہ کہ کمرہ کی دیواروں کو رنگا جائے۔ کھیلتے وقت کھیل کے کپڑے پہنیں جائیں نہ کہ اسکول کے کپڑے پہن کر کھیل کھیلا جائے۔ اس طرح کی حد بندی سے بچے کو ڈسپلن سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔

جنسی دریافت :

تین سال سے چھ سال کی عمر کے بچوں میں جنسی دریافت کا شوق ہوتا ہے۔ بچوں میں تجسّس اور تلاش کی جبلت تو ہوتی ہی ہے۔ اس جبلت کے تحت بچہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنے جسم کے مختلف اعضا کو ہلانے جُلانے اور چھونے اور جاننے پہچاننے میں دلچسپی لیتا ہے۔ اسے اپنی مُنو (عضوِ تناسل) کو چھونے اور مسلنے میں مزہ آتا ہے۔ تنہائی میں یا اپنی پریشانی اور بے آرامی کی حالت میں وہ اپنے عضوِ تناسل سے کھیلنے لگتا ہے۔ والدین کو اس کے اس کھیل کی

طرف بالکل متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو والدین اپنے بچوں کی اس حرکت پر خفا ہوتے ہیں یا انھیں ڈرا دھمکا کر اس حرکت سے باز رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی بے جا مداخلت اور سختی کا بچوں کی جسمانی، ذہنی اور جذباتی نشوونما پر غلط اثر پڑتا ہے۔ بچے کو اپنے عضوِ تناسل سے کھیلتا دیکھ کر اسے گندہ کہنے یا اسے شرمندہ کرنے سے اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے اور اس کی جذباتی صحت خراب ہوتی ہے۔ دراصل بچے کی جنسی دلچسپی اس کی فطرت کا اہم جزو ہے۔

اگر کسی بچے کو نو بالغی اور بالغی کے دور میں مُشت زنی کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کو چھڑانے کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ اسے اس کی دلچسپی کے دوسرے عملی کاموں میں مصروف رکھا جائے۔ اسے جسمانی کھیلوں کے ذریعے خود کو چست و چالاک بننے کا شوق دلایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہ اسے یقین دلایا جائے کہ وہ اپنے والدین اور عزیزوں کی آنکھ کا تارا اور دل کا ٹکڑا ہے۔ بچے کے کردار کی اصلاح کا کام جوش میں نہیں ہوش میں آکر کرنا ہوتا ہے یعنی جذبات سے نہیں عقل سے کام لے کر کرنا ہوتا ہے۔ غصہ، نفرت یا سزا کے استعمال سے بچہ ضدی بنتا ہے اور وہ اپنی عادت کو بدلنے کے بجائے اس کی طرف اور زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹے بچے عام طور سے جنسی مسئلوں سے متعلق سوالات دریافت کرتے ہیں مثلاً بچہ کہاں سے آتا ہے۔ بچہ کیسے بنتا ہے۔ وغیرہ۔ بہتر ہوگا اگر بچے کے سوال کا سیدھا اور صاف جواب دے دیا جائے اور اس کی عمر کے اعتبار سے ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں۔ بچوں کے سوالات کو سن کر خاموش ہو جانے یا ان پر خفا ہونے سے ان کی تربیت پر غلط اثر پڑتا ہے۔

نو بالغی اور بالغی کے دور میں بچوں کو جنس مخالف میں دلچسپی ہو جاتی ہے لیکن وہ کھل کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ وہ ایک دوسرے سے ملنا بھی چاہتے ہیں اور ملتے بھی نہیں۔ چنانچہ ڈسپلن کے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کو جنسی مسئلے سمجھانے کے لیے اس سادگی اور صفائی سے بات نہیں بنتی جو پانچ چھ برس کے بچوں کو سمجھانے کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ ان سے بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوتی ہے۔

نو بالغی کا دور بڑا ہی نازک اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ عمر کے اس دور میں بچہ نہ تو بچہ ہی ہوتا ہے اور نہ ہی بڑا۔ وہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے بے حد کمزور ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت میں توازن نہ ہونے کی بنا پر اسے متلون مزاج کہا جاتا ہے۔ اس کے مزاج کی ہیجانی کیفیت اسے

پریشان کرتی ہے۔ وہ نہ تو اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے جذبات پر قابو پا سکے اور نہ ہی اس قابل ہوتا ہے کہ بزرگوں کے خیالات کا احترام کر سکے۔ اسے نہ تو اپنے مستقبل کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی سماجی اقدار کا لحاظ۔ اس صورت میں والدین اور اساتذہ کا کام اس کو اپنے قریب لا کر کچھ پابندیوں کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ ان کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنا ہوتا ہے جن میں وہ جماعتی شکل میں حصہ لے سکیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہذّب طریقے سے پیش آسکیں۔ کھیلنے کودنے اور کھانے پینے کے مشترک پروگراموں سے اُنھیں خوشی ہوتی ہے۔ والدین اور استادوں کی زیرِ نگرانی سرگرمیوں میں شریک رہنے سے نو بالغ بچوں کے جذبات کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اس عمر میں ہم جنس یا جنسِ مخالف کے دو بچوں کو یعنی لڑکے اور لڑکی کو تنہا گھومنے پھرنے یا تنہائی میں بیٹھ کر ہنسنے بولنے اور اچھلنے کودنے کے کم سے کم مواقع دیے جائیں۔

گھریلو زندگی اور کام

ڈسپلن کی تربیت کے لیے گھر کے ماحول کو خوش گوار اور سازگار بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ گھر چھوٹا ہو یا بڑا' جھونپڑی ہو یا محل صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ گھر کا سامان جو بھی ہو سلیقے کے ساتھ مناسب جگہ پر رکھا رہنا چاہیے۔ ماں باپ اور دیگر اراکین خاندان کے درمیان نہایت خوش گوار تعلقات رہنے چاہییں۔ غرض یہ کہ گھر کا ماحول سیکھنے سکھانے کے لیے سازگار ہونا چاہیے۔ بچہ فطری طور پر اپنے ماحول سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ پہلے دیکھتا ہے اور پھر نقل کرتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو صحت و صفائی کی طرف مائل دیکھ کر خود صحت و صفائی کی طرف توجہ دینے لگتا ہے۔ والدین کے کھانے پینے بولنے جاگنے' اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے کے طریقوں کو دیکھ کر خود بخود ان کی نقل کرنے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچے کو محبت' توجہ' قبولیت اور آزادی کی اشد ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ماں باپ کو بچے کی طرف محبت بھری توجہ دینا چاہیے۔ اُنھیں کبھی کبھار اس کے کھیلوں میں شریک ہونا چاہیے اور اُنھیں اپنے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی لگانا چاہیے۔

عام طور سے گھروں میں اس بات پر نرم گرم گفتگو ہوتی رہتی ہے کہ کون کیا کام کرے اور کس طرح کرے۔ گھر کے کاموں کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے وغیرہ جب پانچ چھ

برس کی عمر کے بچے کھیلنے کودنے کے بعد اپنے کھلونوں کو ادھر ادھر پڑا چھوڑ دیتے ہیں وہ اُنھیں اٹھا کر مقررہ جگہ پر رکھنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ دس بارہ برس کی عمر کی بچی کھانے کے بعد اپنے گلاس اور پلیٹ کو میز پر رکھا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ وہ نہ تو برتنوں کو صاف کرنے میں اپنی امی کی مدد کرتی ہے اور نہ ہی میز کو صاف کرنا اور میز پر برتن لگانے کا کام کرتی ہے۔ سولہ سترہ برس کا لڑکا اپنا بستر بھی یوں ہی پڑا چھوڑ دیتا ہے اور اس کی کتابیں ادھر ادھر پڑی رہتی ہیں۔ تو گھر کی گندگی کو دیکھ کر کبھی کبھی ماں باپ سر پکڑ کر یہ افسوس کرتے ہیں کہ گھر کے کاموں میں کوئی بچہ مدد نہیں کرتا ہے۔

بچوں میں کام کرنے کی عادت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُنھیں بچپن ہی سے گھر کے کاموں میں شریک رہنے کا شوق دلایا جائے۔ اُنھیں اپنے کاموں کو خود کرنے کا شوق دلانا کوئی مشکل کام نہیں اس لیے کہ ہر تندرست بچہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور کام کے کرنے میں اسے خوشی ہوتی ہے۔ محنت کرنا، نئی نئی باتیں معلوم کرنا اور آپس میں مقابلہ کرنا بچے کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں اور غریب گھرانوں میں جو والدین یہ سمجھ کر اپنے بچوں سے کام نہیں کراتے کہ بچپن کھیلنے اور آرام کے لیے ہوتا ہے کام کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔ جب سمجھ دار ہو جائیں گے تو خود بخود اپنا کام کرنے لگیں گے' اُنھیں بالآخر مایوسی اور ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان کے گھروں میں جا کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی کی ذمے داری صرف ماں کی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جن بچوں کو بچپن میں کام کرنے کی عادت نہیں ہوتی وہ بڑے ہو کر کبھی بھی کام کرنے میں خوشی نہیں محسوس کرتے اور ان میں کام کرنے کا سلیقہ پیدا نہیں ہوتا وہ کام کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور اگر کچھ کرتے بھی ہیں تو اس میں صفائی ستھرائی نہیں نظر آتی۔

یہ ضرور ہے کہ جو ماں گھر کی صفائی اور سجاوٹ کا کام خود ہی کر لیتی ہے اور بچوں کا کام بھی وہ خود ہی کر لیتی ہے تو وہ تھوڑا بہت وقت دوسرے کاموں کے لیے بھی بچا لیتی ہے لیکن وہ اپنے بچوں میں کام کی عادت نہیں پیدا کرا سکتی۔ اس کے برعکس وہ ماں جو بچے کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے کھلونوں کو مقررہ جگہ پر رکھواتی ہے۔ کھانے کے برتنوں کو دھلوانے میں بچی کو ساتھ لگاتی ہے یا بستر درست کرانے میں بچے کے ساتھ لگی رہتی ہے یا گھر کی پوری صفائی میں بچوں کی مدد کرتی ہے' وہ اس طرح اپنا زیادہ وقت کام میں تو صرف کرتی ہے لیکن اس کی وجہ

سے بچے کو ڈسپلن کی تربیت حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اسے زندگی میں آرام اور سکون ملتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لگا کر تعاون احساسِ ذمہ داری اور اشتراکِ عمل کا جو سبق سکھاتی ہے وہ اُنھیں عمر بھر یاد رہتا ہے اور ان کے کام بھی آتا ہے۔

جن بچوں سے بچپن میں کام نہیں کرایا جاتا ان کو عام طور سے غیر ذمہ داری اور لاپروائی کی عادت ہو جاتی ہے۔ ان کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ اسکول سے آکر اپنے اسکول کے کپڑوں کو اتار کر ٹھیک سے رکھ دیں اور گھر کے کپڑے ٹھیک سے پہن لیں اُنھیں بازار سے سودا سلف لانے میں شرم آتی ہے۔ اُنھیں کسی کام کے لیے کہا جاتا ہے تو مچلنے لگتے ہیں اور گھر کا ماحول تکلیف دہ اور غم آلود بن جاتا ہے۔ اس قسم کا ماحول اُس گھر میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جہاں بچے ہوتے ہیں اور اُنھیں بچپن میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بچوں سے روزانہ گھر کا کوئی نہ کوئی کام ضرور کرایا جائے اور محبت اور پابندی کے ساتھ کرایا جائے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ تقریبات کے موقع پر یعنی یوم پیدائش کی تقریب' شادی بیاہ کی تقریب اور تیوہاروں سے متعلق تقریبات میں بچے زیادہ خوشی اور دلچسپی سے کام کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ تقریبات کے موقع پر بچوں سے ان کی صلاحیت اور دلچسپی کے مطابق کام کرا کر اُنھیں کام کرنے کا شوق دلایا جائے۔

بہر حال بچوں سے بالخصوص نو بالغ اور بالغ بچوں سے گھر کے کاموں میں ضرور مدد لینی چاہیے۔ کام تجویز کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کام ان کی پسند کے ہیں یا نہیں۔ کام کام ہوتا ہے۔ جو کام بھی ہو اسے محنت اور دلچسپی کے ساتھ کرنے کے بعد خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ماں باپ کا قطعی طور پر یہ کہنا کہ میاں ندیم آج تو تم کو سبزی خرید کر لانا ہی ہوگی یا عائشہ آج کھانے کے بعد تم کو برتن دھونے ہی ہوں گے' بچوں کے حق میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح کام کرانے سے بچوں میں کام کرنے کی عادت بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی سیکھتے ہیں۔ ہمارا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ گھما پھرا کر بات کرنے یا مشکوک اور مذبذب انداز میں کسی کام کو کہنے سے وہ فائدہ نہیں ہوتا جو صاف طور پر محبت اور اعتماد کے ساتھ کہنے سے ہو سکتا ہے۔ ذمہ داری دے کر ذمہ داری کا احساس پیدا کرانے سے کام کو ذمہ داری کے ساتھ پورا کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

والدین کی رہنمائی کے لیے ہم نے شیر خوارگی اور بچپن کے دور کے چند ایسے مسئلوں کا

اور ان سے متعلق قابل عمل ہدایات کا ذکر کیا ہے جن سے والدین کو عام طور سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں نو بالغی اور بالغی کے دور کے مسئلوں مثلاً تضیع اوقات، سگریٹ نوشی، غیبت، تصنّع، چغل خوری اور چوری وغیرہ پر بحث کرنے کی گنجایش نہیں، البتہ والدین کے لیے یہ اشارہ کافی ہے کہ وہ موقع محل کے اعتبار سے بچے کی اصلاح کے لیے جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں کریں لیکن نہ بھولیں کہ طریقہ سے زیادہ اس کے استعمال سے مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جو طریقہ اختیار کریں اس کے استعمال میں بچے کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے دیں۔ بچے کے ساتھ محبت و مروت، شرافت، اخلاق اور عفو و درگزر سے پیش آئیں اور بچے کی غلطی کو غلطی ثابت کرنے پر زور دیے بغیر اس کی اصلاح کریں۔ محبت پیار اور عزت و قبولیت سے بچے کی اصلاح کرنے میں جو مدد ملتی ہے وہ غصہ، نفرت اور بے عزتی کرنے سے نہیں ملتی بلکہ اس قسم کے غیر سماجی رویے سے بچے کے کردار کو اور زیادہ خراب کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اُستادوں کے لیے چند ہدایات

والدین کی طرح استاد بھی بچے کو خود آموز ڈسپلن سکھانے کے ذمے دار سمجھے جاتے ہیں۔ ڈسپلن کی تربیت کے لیے بچپن کو پہلی منزل کہا جاتا ہے اور لڑکپن کو دوسری منزل۔ پہلی منزل میں بچوں پر والدین کی تعلیم و تربیت کا جو اثر ہوتا ہے وہی اثر ثانوی منزل میں استادوں کی تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے لیکن استادوں کی تعلیم و تربیت کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار عام طور سے والدین کی تربیت پر ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں جو عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں دوسری منزل پر پختگی پیدا ہوتی ہے بچپن میں پڑی عادتوں کا لڑکپن میں بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں عام زندگی میں ڈسپلن کی کمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ سب بچوں کو نہ تو تین سے چھ برس کی عمر میں نرسری اسکولوں میں جانا نصیب ہوتا ہے اور نہ ہی چھ برس سے بارہ برس کے تمام بچوں کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے اور جن خوش نصیب بچوں کو یہ مواقع ملتے بھی ہیں تو اسکولوں میں انھیں نہ وہ تربیت ملتی ہے اور نہ وہ ماحول جسے خود آموز ڈسپلن کے لیے سازگار سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال ہم ڈسپلن کے مقاصد اور معیار کے بارے میں جو کچھ کہہ چکے ہیں ان کی روشنی میں ڈسپلن کی تربیت کی ذمہ داری پہلے والدین پر اور پھر استادوں پر عاید ہوتی ہے۔ ہاں استادوں کو جن مسئلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ والدین کے مسئلوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

اُستادوں کے لیے ڈسپلن کا مسئلہ خاص طور سے اس لیے پیچیدہ بن جاتا ہے کہ ان کی جماعتوں میں مختلف قسم کے بہت سے بچے ہوتے ہیں۔ ہر بچے کا تمدنی اور تہذیبی پس منظر مختلف ہوتا ہے اور اُنھیں روزانہ کم از کم چھ سات گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر والدین کو چھ سات برس کے صرف دس بارہ بچوں کی نگرانی کرنا پڑے تو وہ پریشان ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اسکول میں ایک اُستاد کو تقریباً تیس پینتیس بچوں کی نگرانی کرنا ہوتی ہے۔ بچوں کی اتنی بڑی تعداد کو

ڈسپلن میں رکھنے کا مسئلہ اسناد کے لیے کئی اعتبار سے مشکل بن جاتا ہے۔ ایک چھ برس کا بچہ اگر گھر پر کوئی ناپسندیدہ حرکت کرتا ہے تو وہ اکیلا ہوتا ہے اور اس لیے اس کی ناپسندیدہ حرکتوں سے کوئی اور متاثر نہیں ہوتا۔ جماعت میں کسی ایک کی شرارت مثلاً برابر میں بیٹھے ہوئے طالب علم سے باتیں کرنا یا کاغذ کا ہوائی جہاز بنا کر ادھر ادھر پھینکنا پوری جماعت کی توجہ کو اُچاٹ کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچوں کو پڑھانے کے لیے جماعت میں طلبہ کا خاموش رہنا اور سب بچوں کا استاد کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کی نظروں میں وہ استاد اچھا سمجھا جاتا ہے جس کی جماعت میں سناٹا رہتا ہے اور طلبہ ہمہ تن گوش بن کر استاد کو سنتے رہتے ہیں۔ دیکھنے والے غیر شعوری طور پر اس خاموشی اور فرماں برداری پر خوش ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی فرماں بردار جماعت استاد کے لیے اچھی سمجھی جاتی ہو لیکن تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر ایسی جماعت کو اچھا نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اس طرح طلبہ مجہول اور فرماں بردار بن کر جو کچھ سیکھتے ہیں اسے سیکھا ہوا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو خارجی دباؤ سے سُنی باتوں کو یاد کر لینا ہوتا ہے۔

خارجی دباؤ سے جو ڈسپلن قائم کیا جاتا ہے وہ شخصیت کی نشو و نما کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں تعلیمی تحقیقات کے ذریعے ڈسپلن قائم رکھنے کے ایسے کئی طریقے معلوم ہوئے ہیں جن میں بچوں کو زبردستی دبا کر رکھنا بہت برا سمجھا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ تعلیمی منصوبے بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق بچوں کے مشورے سے تیار کیے جائیں اور ناپسندیدہ حرکتوں کی اصلاح ان کے نتائج کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے نتیجہ پر مبنی طریقہ استعمال کیا جائے۔ جدید تعلیمی نظریے کی روشنی میں وہ طریقہ تدریس زیادہ مفید اور موثر سمجھا جاتا ہے جس میں بچوں کو اظہارِ ذات کا موقع ملے اور ان کی رائے کا احترام کیا جائے۔ جو استاد بچوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش رکھتا ہے اس کے بچے اس کی عدم موجودگی میں آپس میں لڑتے جھگڑتے اور طرح طرح کی غیر سماجی حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کے دل میں نہ تو استاد کی محبت اور احترام رہتا ہے اور نہ ہی اُنھیں اپنی مادرِ علمی سے کوئی لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ بالآخر یہی بچے بڑے ہو کر دوسروں کے لیے طرح طرح کی پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بنتے ہیں۔

خارجی دباؤ کی وجہ سے بچے میں خود سے سوچنے، خود سے کوئی فیصلہ کرنے اور کسی ذمہ داری کو قبول کر کے اسے ٹھیک سے پورا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ جو طالب علم استاد کے خوف سے اس کی بتائی ہوئی پسندیدہ اقدار کو قبول کرتا ہے وہ اُنھیں اپنی زندگی میں استعمال نہیں کر پاتا اور نہ ہی وہ کسی آزاد معاشرے میں اچھی سماجی زندگی بسر کرنے کے قابل بن پاتا ہے۔ خارجی دباؤ کا تربیت یافتہ بچہ سدا دوسروں کا محتاج رہتا ہے وہ دوسروں کی بتائی ہوئی نصیحتوں کو سنتا ضرور ہے لیکن انھیں سیکھتا نہیں۔ بچہ سیکھتا ہے کچھ کر کے وہ سیکھتا ہے اپنی دلچسپی اور اپنی کوشش سے اور کوشش بھی وہ جس میں اسے مکمل آزادی ملتی ہے اور صحیح رہنمائی اور محبت حاصل ہوتی ہے۔

مانا کہ خارجی دباؤ اور خاموشی تعلیمی نقطۂ نظر سے بری چیز ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈسپلن کس طرح قائم رکھا جائے تاکہ استاد اپنا فرضِ منصبی بحسن و خوبی انجام دے سکے۔

دیکھا یہ گیا ہے اور پڑھا بھی یہی ہے کہ جو تعلیمی منصوبہ بچوں کے مشورے سے اور ان کی دلچسپیوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے، اسے پورا کرنے کے لیے بچے خوشی خوشی کام کرتے ہیں اور بامعنی طور پر سیکھتے ہیں اور ایسے بچوں کے ساتھ ڈسپلن کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ جب بچوں کو ان کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق کام مل جاتے ہیں تو وہ خود کو کام میں مصروف رکھتے ہیں۔ اُنھیں کام کرتے وقت کسی قسم کی بے چینی، پریشانی اور تکان محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی توجہ غلط یا ناپسندیدہ کاموں کی طرف منتقل ہوتی ہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ استاد کو روزانہ کے تعلیمی کاموں کا پروگرام بچوں کے مشورے سے ان کی دلچسپیوں کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس طرح کام کرنے سے استاد کو درس و تدریس کے دوران ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں پیش آتی۔

ابتدائی تعلیم کے اسکولوں میں ڈسپلن قائم رکھنے کا ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ طلبہ کو مختلف قسم کی ذمہ داریاں دی جائیں اور ڈسپلن سے متعلق مسئلوں کو ذمہ دار طلبہ کی مدد سے حل کیا جائے۔ چھوٹے بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ خود سے اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی پورا کر سکیں۔ اُنھیں استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں اپنی انفرادیت کا خیال ضرور رہتا ہے۔ وہ اپنے تشخص اور انفرادیت کو باقی رکھنے کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر کام

کرنے میں بے حد خوش ہوتے ہیں۔ اُنھیں مل کر کام کرنے اور پیار محبت کے ساتھ رہنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی نظروں میں اچھا بنے رہنے کے خیال سے اپنا کام اچھی طرح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کا ہر فرد اپنے کردار میں پسندیدہ خوبیاں اور اچھائیاں پیدا کرے۔ ذرا بڑی عمر کے بچوں میں ڈسپلن قائم رکھنے اور انھیں ڈسپلن سکھانے کے لیے بچوں کی حکومت کا قیام بہت مفید ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے تحت ایسے کام کرائے جائیں جن کو کرتے وقت بچوں کو خوشی ہو۔ بچوں کی حکومت کے عہدہ داروں کو جو ذمہ داریاں دی جائیں انھیں مناسب رہنمائی اور نگرانی کے ذریعے پورا کرایا جائے اس طرح ان میں خود کو ڈسپلن میں رکھنے کی عادت پیدا ہوگی اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو حکومت کی نگرانی میں کام کر کے فرائض کو ادا کرنے کی عادت ہوگی۔ استاد کی رہنمائی میں بچوں کی حکومت کے فیصلے ماننے کی ترغیب دلائی جائے جیسے بچوں کی حکومت یہ طے کرتی ہے کہ صبح کے ترانے میں کس روز کس کو باہر سے بلایا جائے۔ ترانے کو وقت پر ٹھیک سے کرانے کے لیے کس کو ذمہ دار بنایا جائے۔ چھٹی کے دن کون کون سے کھیل کھیلے جائیں یا سیر کے لیے کہاں جایا جائے۔ یا اس مہینے تحریری مقابلہ میں کس عنوان پر مضامین لکھائے جائیں وغیرہ۔ بچوں کی حکومت کا جو فیصلہ ہو اسے سب بچوں کو ماننا چاہیے۔

استاد کے لیے ڈسپلن سے متعلق مسئلوں میں ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی لڑائی جھگڑوں کی وجوہات اور اسباب کو کس طرح سمجھا جائے اور پھر ان کو سمجھنے کے بعد اصل مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ بہت سے مسئلے ایسے ہوتے ہیں جو بادی النظر میں انفرادی معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت وہ ہوتے ہیں اجتماعی۔ مثلاً عین ممکن ہے کہ کسی جماعت میں دو چار طلبہ ایسے ہوں جو کسی کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ انھیں لڑنے جھگڑنے اور شرارتیں کرنے ہی میں مزہ آتا ہے اور ان کی وجہ سے پوری جماعت میں لڑائی جھگڑے کا ماحول بنا رہتا ہے اور پوری جماعت کی پریشانی کے سبب ڈسپلن کے مسئلے پیدا ہوتے ہوں۔ یہ صورتِ حال عام طور سے اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مجوزہ سبق یا تو جماعت کے عام معیار سے بہت زیادہ مشکل ہو یا وہ اتنا آسان ہو کہ طلبہ اسے بالکل بے کار سمجھنے لگیں۔ ایسی جماعت میں طلبہ استاد کے خوف اور دباؤ کی وجہ سے بظاہر خاموش رہتے ہیں لیکن جب باہر نکلتے ہیں تو خود کو

بالکل آزاد پاکر طرح طرح کی شرارتیں کرتے ہیں اور اسکول کا نام بدنام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جماعت میں طلبہ تہذیبی اور تعلیمی اعتبار سے یکساں نہ ہونے کی بنا پر اپنا اپنا گروپ بناکر استاد کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح استاد کو ایک طرف تو اجتماعی مسئلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور دوسری طرف انفرادی مسئلوں سے مثلاً احمد علی صاحب کی جماعت میں ایک طالب علم مقیط خاں تھا وہ روزانہ شہر سے آتا تھا اور وہ اپنے اخلاق اور عام رکھ رکھاؤ کی وجہ سے دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ اور استادوں کی نظر میں اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ایک روز جماعت میں شور مچاکر سب کو پریشان کردیا۔ اس نے اپنے استاد احمد علی صاحب کی بالکل پروانہ کی۔ وہ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے انھوں نے پڑھانا بند کردیا اور مقیط خاں کے علاوہ سب طلبہ کو کتب خانہ جاکر نجی طور پر مطالعہ کرنے کی اجازت دے دی۔ جب سب طلبہ باہر چلے گئے تو احمد علی صاحب نے مقیط خاں کو اپنے پاس بلایا اور نہایت ہمدردی اور محبت سے اس کی اچانک اور خلافِ امید شرارت کا سبب معلوم کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کے والد نے ہفتہ کے دن دوسری شادی کرلی ہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے پریشان تھا۔ اس نے اپنے غم اور غصہ کو گھر پر دبائے رکھا لیکن اس کا اظہار اسکول میں آکر کیا تاکہ کوئی اس سے ہمدردی کرسکے۔ احمد علی صاحب نے اس کی تسلّی کی اور اسے کئی روز تک اپنے ساتھ دارالاقامہ میں رکھا۔ جب مقیط خاں کے والد صاحب آئے تو ان کو بھی سمجھایا کہ وہ مقیط خاں کا خاص طور سے خیال رکھا کریں۔

استاد کا فرض ہے کہ وہ ڈسپلن سے متعلق مسئلوں کو حل کرنے سے پہلے احمد علی صاحب کی طرح یہ معلوم کرے کہ مسئلہ کیوں پیدا ہوا ہے۔ دیکھے کہ مسئلہ انفرادی ہے یا اجتماعی۔ انفرادی مسئلے کو حل کرتے وقت وہ ان ضمنی حالات کو نظر انداز کرسکتا ہے جن میں پوری جماعت شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح اجتماعی مسئلوں کو حل کرتے وقت ایسے بچوں کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو پس پردہ رہ کر شرارتیں کرتے ہیں انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے مسئلوں کو حل کرتے وقت فرد اور جماعت دونوں کی ضرورتوں کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً مقیط خاں کے معاملے میں احمد علی صاحب نے اسے اپنا غصہ ظاہر کرنے سے نہیں روکا۔ اس کی شرارت کے وقت اس کو بالکل نظر انداز کیا۔ جماعت کے دوسرے تمام طلبہ کو نجی مطالعہ کے لیے کتب خانہ بھیج کر مقیط خاں سے علاحدگی میں بہت پیار اور محبت کے ساتھ بات

کی۔ اگر سب طلبہ کے سامنے مقیط خاں کو پیار کیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ دوسرے طلبہ بھی یہ سوچ سکتے تھے کہ شرارت کرنا چاہیے تاکہ استاد کی مخصوص توجہ اور محبت حاصل ہو سکے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر استاد کو ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے احمد علی صاحب کی طرح ایسا طریقہ اختیار کرنا اچھا ہوتا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ خیز طالب علم کو فائدہ ہو اور جماعت کے دوسرے طلبہ پر اچھا اثر پڑ سکے۔ انفرادی مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مسئلہ خیز طالب علم کو خوش کرنے کے لیے اسے کوئی خاص کام دے دیا جائے جیسے طلبہ کی حاضری لینا یا پیریڈ ختم ہونے پر سب طلبہ سے کاپیاں لے کر استاد کے سپرد کر دینا وغیرہ اور اس کی اس طرح رہنمائی کی جائے کہ اس کا غصہ ختم ہو جائے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کی جماعت میں کوئی حیثیت ہے۔ تھوڑی عمر کے بچوں میں یہ ہو سکتا ہے کہ مسئلہ خیز بچے کو سمجھانے بجھانے کے بعد مٹی سے کھلونے بنانے یا کاغذ پر تصویریں بنانے کا کام دے دیا جائے تاکہ اس کی تخلیقی قوت اور صلاحیت کی نشوونما ہو سکے۔ بہر حال استاد کی ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے طریقہ کار سے انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے بچوں پر اچھا اثر ہو۔

اب ہم اپنے خیال کی مزید وضاحت کے لیے ذیل میں ڈسپلن سے متعلق چند مخصوص مسئلوں پر بحث کرتے ہیں تاکہ یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ مسئلہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا کوئی نہ کوئی سبب یا مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اس سبب یا مقصد کو جان کر ہی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو فرد اور جماعت دونوں کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

نقل کرنے کی عادت :

جو طالب علم استاد کو دھوکا دے کر نقل کرتا ہے یعنی چوری کرتا ہے تو وہ خود کو نہیں بلکہ دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے اچھے نمبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے وہ وقتی طور پر پریشان ہو یا اس کے والدین کا اصرار ہو کہ اسے اچھے نمبر حاصل کرنا چاہییں۔ اگر اچھے نمبر نہ آئے تو اسے وہ انعام نہیں مل سکے گا جس کا اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھے نمبر نہ آنے پر والدین ناراض ہوتے ہیں اور بچے کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اس لیے وہ نقل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سمجھ دار استاد کا فرض ہے کہ وہ بچے اور

اس کے والد دونوں سے مل کر یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ نمبروں کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے ایمانداری کے ساتھ مسلسل محنت کرنے کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ تعلیم کا مقصد نقل کر کے امتحان میں کامیاب ہونا نہیں ہے بلکہ ایمانداری اور محنت سے کام کر کے علم حاصل کرنا اور خود کو اچھا انسان بنانا ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ نقل کرنے والا بچہ اپنے سابقہ تجربوں اور تعلقات کی روشنی میں ضرورت سے زیادہ مقابلہ کرنے کا عادی ہو گیا ہو اور چاہتا ہو کہ اسے جماعت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنا چاہییں یا وہ اس لیے خوف زدہ ہو کہ اچھے نمبر نہ آنے پر اسکول میں پٹائی ہو سکتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں استاد کا کام نقل کرنے والے بچے کی ہمت افزائی کرنا ہوتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کے مقابلے میں اس کی اچھائیوں کو ظاہر کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے شوق اور علمی تحصیلات کی تعریف کر کے اسے زیادہ سے زیادہ توجہ کے ساتھ مطالعہ کا شوق دلانا چاہیے۔ اسے یقین دلایا جائے کہ اس کی کمزوری کو دور کرنے میں خندہ پیشانی کے ساتھ مدد کی جائے گی۔ اس طرح اس میں خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس کی کسی کمزوری پر خفگی کا اظہار نہ کیا جائے۔ اس کی دل سے عزت کی جائے اور یقین دلایا جائے کہ ہر شخص اپنی کمزوری کو بشرطیکہ وہ خود بھی خواہش مند ہو دوسروں کی تھوڑی بہت مدد سے دور کر سکتا ہے۔

نقل کرنے کو چھوت کی بیماری سمجھا جاتا ہے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرے کو نقل کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور اس طرح پوری جماعت کو نقل کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں استاد کو سب سے پہلے یہی سوچنا چاہیے کہ پوری جماعت میں یہ بری عادت کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ اسے اپنے طریقۂ کار کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بچوں کو ایمانداری کے ساتھ محنت کرنے اور کام کرنے کا شوق دلانا چاہیے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوری جماعت نقل کر کے استاد پر اپنی نافرمانی کا اظہار کرتی ہے۔

نقل کرنے کی عادت انفرادی ہو یا اجتماعی اسے ٹھیک کرنے کے لیے یہ طریقہ بالکل غلط سمجھا جاتا ہے کہ نقل کرنے کی وجہ معلوم کر کے نقل کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ سزا سے اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ نقل کرنے کا خیال کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرد یا جماعت کے غلط رویّے کو پیار محبت کے

ساتھ بدلنے کی کوشش کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ پوری جماعت کے سامنے جمہوری طرز پر مسئلہ کو پیش کیا جائے۔ اس کے اچھے اور برے اثرات پر کھلے دل سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ طلبہ کی شخصیت کا احترام کیا جائے۔ ان کے خوف اور ارادوں کو معلوم کیا جائے۔ ان کی باتوں کو پوری توجہ سے سنا جائے۔ بحث و مباحثہ کے لیے دوستانہ ماحول پیدا کیا جائے۔ اس طرح باہمی مشورے سے نقل کی بری عادت ختم کرائی جائے اور صحیح طور پر سیکھنے کا شوق دلایا جائے۔ اگر ضرورت ہو تو بچوں کی حکومت کے زیر اہتمام نقل کرنے کے خلاف مہم شروع کی جائے۔

گروہ بندی :

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جماعت کے چند ہم خیال طلبہ اپنا علاحدہ گروہ بنا لیتے ہیں مثلاً اوم پرکاش جسمانی اعتبار سے اپنی جماعت میں سب سے زیادہ خوبصورت اور تندرست لڑکا ہے اور وہ خود کو بڑا بہادر اور نڈر ثابت کرتا ہے۔ کچھ طلبہ جو اس کے زیر اثر ہوتے ہیں اس کے ساتھ مل کر اپنا ایک گروہ بنا لیتے ہیں اور پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے جماعت اور اسکول کے ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے استاد گروہ کے سرغنے اوم پرکاش کو اپنے قریب لائے۔ اس کے دل میں اپنا اعتماد اور بھروسا پیدا کرانے کے بعد اسے نہایت اطمینان اور محبت کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ وقت کو بھی روپے پیسے کی طرح سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہوتا ہے۔ طالب علم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے وقت کا صحیح طور پر استعمال کرے اور اپنے تعلیمی معیار کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ عام طور سے گروہ بندی ذاتی مفاد اور خود نمائی کے لیے ہوتی ہے اس قسم کے گروہ کے پیدا کردہ مسئلوں کو حل کرنے کے لیے باہمی گفت و شنید کا طریقہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ بعض مسئلے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنے ہی سے فائدہ ہوتا ہے۔

جماعت کے کمرے میں ڈسپلن کا مسئلہ اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جب کوئی گروہ کسی خاص طالب علم کو خاطر میں نہیں لاتا اور اسے قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر گروہ ناقابل برداشت غلطی کا مرتکب ثابت ہوتا ہے تو اس کے سرغنے سے باز پرس کی جائے اور غلطی ثابت ہونے پر مناسب سزا دی جائے لیکن سزا کا طریقہ ایسا ہونا

چاہیے کہ سرغنے کو اپنی غلطی پر ندامت ہو اور ان کے ساتھ رہنے والوں میں خود کو غیر سماجی حرکتوں سے دور رہنے کا احساس پیدا ہو۔

بہتر تو یہ ہے کہ گروہ کے سرغنے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اس کی شرارتوں کے مقاصد کو سمجھا جائے۔ اس کے بعد اس کی توجہ اور دلچسپی مفید اور کار آمد کاموں میں پیدا کرائی جائے۔ مثلاً اوم پرکاش کو سمجھایا جائے کہ وہ سماجی کاموں میں لگ کر اپنے گروہ میں اپنا مقام پیدا کرے۔ اسے پیار محبت کے ساتھ یہ سمجھایا جائے کہ اچھا طالب علم یا اچھا آدمی اپنی تفریح اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ جماعت یا اسکول کی خوشنودی اور بھلائی کا بھی خیال رکھتا ہے۔ لیڈر بننا کوئی بری بات نہیں۔ یاد رہے کہ وہ لیڈر زیادہ عزت اور شہرت حاصل کرتا ہے جو خود تعمیری کام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی تعمیری کام کراتا ہے اور جسے اپنے سے زیادہ دوسروں کے آرام اور خوشی کا خیال رہتا ہے۔ ڈسپلن کے مسئلوں کو حل کرنے میں جماعت کے تمام طلبہ کے مشوروں سے بھی مدد ملتی ہے۔ اچھا ہے کہ استاد جماعت کے سامنے مسئلہ پیش کرے اور بحث و مباحثہ کے ذریعے اس کا حل تلاش کرے۔ اور ایسے طلبہ کے ساتھ خاص طور سے ہمدردی کرے جو خوف زدہ ہو کر یا مجبوراً گروہ میں شامل ہوتے ہیں اور ناخوش رہتے ہیں۔

جب کوئی گروہ یا گروہ کا سرغنہ کسی غیر سماجی طالب علم کو اپنے سے دور رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے ڈسپلن کے مسئلے پیدا ہوتے ہیں تو بالکل ضروری نہیں کہ گروہ ہی خطاوار ہو۔ خطاوار وہ طالب علم بھی ہو سکتا ہے جو دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا نہیں جانتا۔ مثلاً تقسیم ہند سے پہلے ہمارے دارالاقامہ میں ایک لڑکا سعد اللہ خاں رہتا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے متمول گھرانے سے تھا۔ اسے اپنے والدین کے عیش و عشرت اور درجنوں خادموں پر بڑا غرور تھا۔ وہ ہر وقت اپنے ہر ایک ساتھی کے ساتھ اپنے گھر والوں کی باتیں کر کے ان پر اپنا رعب جمانا چاہتا تھا۔ نہ تو وہ اپنا بستر ہی ٹھیک رکھتا تھا اور نہ ہی دارالاقامہ کے کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ غرض یہ کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے دارالاقامہ اور درجہ میں "شیخی خورا" کے نام سے پکارا جانے لگا اور اس کے سب ساتھی اس سے دور رہنے لگے اور ایک ایک کر کے میرے پاس آکر اس کی شکایتیں کرنے لگے۔ میں نے سعد اللہ خاں کے غیر سماجی رویے کو بدلنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن ناکام اور مجبور ہو کر اسے نگراں مدرسہ عتیق احمد صاحب کے سپرد کیا۔ انھوں نے اسے سمجھا بجھا کر اور اس کے والدین کا تعاون حاصل کر کے تقریباً دو مہینے کے اندر دوسرے طلبہ کے ساتھ

رہنے اور مل جل کر کام کرنے پر آمادہ کیا۔ سعد اللہ خاں کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات گروہ کی وجہ سے نہیں بلکہ فرد کی وجہ سے بھی ڈسپلن کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

کام پورا نہ کرنے کا مسئلہ :

امتحان میں مسلسل ناکام رہنے والا بچہ بھی استاد کے لیے مستقل طور پر ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بچہ بھی ایک مسئلہ بنا ہوتا ہے جو زولنہ کا کام بھی پورا نہیں کرتا ہے۔ جماعت میں دیے ہوئے کام کو پورا نہ کرنے یا ٹھیک سے پورا نہ کرنے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان اسباب کو جان کر یہ کوشش کرنا چاہیے کہ بچے کے ساتھ کسی بنے بنائے اصول کے مطابق نہ سلوک کیا جائے۔ کام پورا نہ کرنے کا سبب جسمانی بھی ہو سکتا ہے۔ جذباتی بھی ہو سکتا ہے اور سماجی بھی یعنی صحت کی خرابی کے سبب کام پورا نہ کر سکے' گھریلو لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے کام پورا نہ کر سکے۔ گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول نہ ہونے کی وجہ سے کام پورا نہ کر سکے یا والدین کی بے جا محبت اور ہمدردی کی وجہ سے یہ یقین کام نہ کر دے کہ ابا کی سفارش سے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کام بچے کی استعداد کے مطابق نہ ہو۔ کام بچے کی استعداد سے بہت زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی۔ مثلاً اشرف حمید ذاتی مطالعے اور شوق کی وجہ سے اتنا اچھا ہے کہ جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ اسے پہلے ہی پڑھ چکا ہوتا ہے۔ اب وہ موجودہ سبق میں کوئی دلچسپی نہیں ظاہر کرتا اور استاد جماعت اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا یا وہ اس کے معیار کے مطابق کام نہیں دیتا ہے تو وہ جماعت میں دیئے اس کام کو کیوں پورا کرے گا جس کو وہ پہلے ہی پورا کر چکا ہے یا کوئی طالب علم جماعت میں بہت کمزور ہے اور اس کی سیکھنے کی رفتار بہت سست ہے اور استاد اس کی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی کمزوری اور بار بار کی ناکامی کی بنا پر اتنا پست ہمت ہو جاتا ہے کہ محنت سے جی چرا کر وقت ضائع کرنے لگتا ہے اور جماعت میں دیے ہوئے کام کو پورا نہیں کرتا ہے۔

بہر حال مسئلہ پست ہمتی کا ہو یا احساسِ برتری کا طالب علم کو اپنی محبت اور رہنمائی کا یقین دلائے بغیر یا سمجھائے بجھائے بغیر سزا دینے سے صورتِ حال اور زیادہ پیچیدہ بن جاتی ہے۔ کمزوری اور بے توجہی کے اثر کو دور کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ طالب علم کے

ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے اور کام نہ کرنے کا سبب معلوم کر لینے کے بعد اس کی دشواری کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کی جائے۔ مختلف مضامین کی ہفتہ واری یا ماہانہ جانچ کے ذریعہ طالب علم کی ذہنی اور علمی استعداد کا اندازہ ہو سکتا ہے اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون کس مضمون میں کتنا کمزور یا کتنا اچھا ہے۔ اس کے بعد حسبِ ضرورت اس کی مدد اور رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

اچھا تو یہ ہے کہ جماعت بندی محض عمر کے اعتبار سے نہ کی جائے بلکہ فطری طور پر ذہین Intelligent اور غبی Retarted بچوں کی تعلیم کا علاحدہ علاحدہ معقول انتظام کیا جائے۔ موجودہ حالات میں استاد پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ مختلف استعداد کے طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے سوچ سمجھ کر ایسے اسباق تیار کرے کہ جماعت کے ذہین اور غبی دونوں قسم کے طلبہ مستفید ہو سکیں۔

اقدار کا ٹکراؤ:

ڈسپلن سے متعلق بعض مسئلے والدین اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں جیسے ناکامی، کام چوری اور سماجی عدم مطابقت وغیرہ۔ اس قسم کے مسئلوں کو باہمی تعاون کی مدد سے حل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی لیے آج کل زیادہ سے زیادہ زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ گھر اور اسکول کے درمیان قریبی رشتہ بنائے رکھنا چاہیے اور باہمی مشوروں اور اشتراکِ عمل سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہمارے استادوں کو عام طور سے یہ پریشانی ہوتی ہے کہ گھر میں جس اقدار کو اچھا سمجھا جاتا ہے انھیں اسکول میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً بارہ برس کے ارشد خاں کے والد گھر میں برابر یہ کہتے رہتے ہیں کہ جوتے کا جواب جوتے سے اور لاٹھی کا جواب لاٹھی سے دینا ہوتا ہے یعنی طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا ہے لیکن اسکول میں اس کے برعکس اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا چاہیے۔ دشمن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ نفرت کے بجائے محبت کرنی چاہیے وغیرہ اس طرح گھر کی تربیت اور اسکول کی تعلیم سے ارشد خاں کو یہ پریشانی ہوتی ہے کہ کون سی اقدار کو اپنایا جائے اور زندگی میں کن اقدار پر عمل کیا جائے۔ ایسی صورت میں عین ممکن ہے کہ ارشد کی شخصیت میں دہرا پن پیدا ہو جائے اور وہ دل

سے کسی بھی قدر کا حامل نہ بن سکے۔ صحیح اقدار کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ گھر اور اسکول کے درمیان قریبی رشتہ بنا رہے اور والدین کو اسکول کے جلسوں میں شریک ہونے اور تعلیم و تربیت کے طریقوں کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع دیے جائیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد والدین اور اساتذہ کو باقاعدہ ملتے رہنا چاہیے تاکہ ڈسپلن سے متعلق مسئلوں کو حل کرنے میں ایک دوسرے سے مدد مل سکے۔

والدین کے ساتھ مل کر تبادلۂ خیالات کرنے ان کی منشا اور خواہش کو جاننے کے بعد استاد کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ طلبہ ان کے والدین اور استاد کے درمیان کوئی نظریاتی اختلاف نہیں ہے۔ استاد کا جو مقصد ہوتا ہے وہی والدین اور طلبہ کا مقصد بن جاتا ہے یعنی اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کے ذریعے اچھے انسان بنانا۔ اس کے علاوہ والدین کو استاد کی شخصیت، محنت اور کوشش کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اسکول میں جو کام کرائے جاتے ہیں اور جس طرح کرائے جاتے ہیں وہ سب طالب علم کی بھلائی اور ترقی کے لیے ہوتے ہیں۔ اس طرح والدین اور اساتذہ کے باہمی تعاون سے بچے کو اچھا طالب علم اور اچھا انسان بنانے میں مدد ملتی ہے۔

لازمی نتیجے پر مبنی طریقے کا استعمال

ہم مختصر طور پر پہلے بتا چکے ہیں کہ ڈسپلن کی تعلیم و تربیت میں ہمت افزائی اور نتائج پر مبنی طریقوں کے استعمال سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور سزا اور انعام کا طریقہ جمہوری طرز زندگی بسر کرنے کے لیے کیوں نامناسب ہے۔ نتائج پر مبنی طریقہ کا استعمال ابھی ہمارے یہاں عام نہیں ہوا ہے لیکن اس کی افادیت کے پیش نظر یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس طرح استعمال کیا جائے اور اس کے صحیح استعمال سے ڈسپلن کی تربیت میں کس طرح کامیابی ہوتی ہے۔

لازمی نتائج پر مبنی طریقے کے استعمال سے ڈسپلن سے متعلق مسئلوں کو حل کرنے میں فوری مدد مل جاتی ہے۔ یہ طریقہ اپنے بنیادی اصول اور ان کے صحیح استعمال کی وجہ سے جمہوری طریقہ مانا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ بچوں میں خود اعتمادی، خود شناسی اور عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے صحیح استعمال سے بچوں کے ناپسندیدہ رویوں کو بدلنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس طریقہ کے استعمال کے لیے چار بنیادی اصول ہیں جن کے مطابق کام کرنے سے نتائج پر مبنی طریقے کی روح اور افادیت باقی رہتی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جہاں چار برتن ہوتے ہیں ضرور کھنکتے ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کی مختلف دلچسپیوں، خواہشوں اور نظریوں کی بنا پر معاشرے میں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور رہتا ہے۔ آزادئ ہند سے پہلے جب کہ مطلق العنان حکومت تھی زیادہ سے زیادہ مسئلوں کو انعام اور سزا کے لالچ اور خوف کے ذریعے حل کر لیا جاتا تھا۔ ضرورت کے مطابق خارجی دباؤ سے بھی کام نکال لیا جاتا تھا۔ اب جمہوری نظام حکومت میں جسمانی سزا کو بے حد برا سمجھا جاتا ہے۔ انعام و اکرام کے طریقے سے سب مسئلے حل نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ ماہرین تعلیم کا اصرار ہے کہ لازمی نتائج پر مبنی طریقے کو

رواج دیا جائے۔

چار بنیادی اصول :

فریقین کی عزت : کسی مسئلے کو حل کرتے وقت ماں اور بیٹے یا استاد اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے کی عزت اور احترام کا پورے طور سے لحاظ رکھنا چاہیے۔ لازمی نتائج پر مبنی طریقے کو خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کرتے وقت ماں یا استاد کو اپنی عزت کے ساتھ ساتھ بچے کی شخصیت کا بھی پورے طور پر احترام کرنا ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی گنجایش نہیں کہ پہلے بچے پر دھونس جمائی جائے۔ خفا ہوا جائے۔ اس کی بے عزتی کی جائے اور پھر پیچھے ہٹ کر یا خاموش بیٹھ کر اپنی سبکی اور بے حرمتی کرائی جائے۔

مسئلے کی تہ تک پہنچنا :

جب کوئی مسئلہ پیدا ہو یا کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو تو اس کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مسئلہ کچھ بھی ہو اور کیسا بھی ہو اس میں فریقین کی کوئی نہ کوئی غرض ضرور چھپی ہوئی ہے مثلاً ذاتی وقار، شہرت کی ہوس، کامیابی کی تمنا اور ناکامی کا خوف یا حق تلفی کا ڈر۔ یہ وہ محفوظات ذہنی ہیں جن کو عام طور سے ظاہر نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان کو نظر انداز کرنے سے فریقین کے درمیان کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور مسئلہ کو حل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہو تو والدین اور اساتذہ کو اس کے اسباب و علل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اصل مقصد اور سبب معلوم کرنے کے بعد اس میں اعتدال پیدا کر کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

عام طور سے بچوں کی شرارتیں ان کے غلط فہمی پر مبنی مقاصد کی بنا پر ہوتی ہیں۔ وہ شرارت کرتے ہیں توجہ حاصل کرنے کے لیے انتقام لینے کے لیے، اقتدار حاصل کرنے کے لیے یا اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے۔ یہی وہ خاص مقاصد ہیں جن کے لیے اکثر والدین اور بچوں کے درمیان، استادوں اور شاگردوں کے درمیان یا خود بچوں اور بچوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے اکثر بڑوں میں بھی جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو پہلے اس کے مقصد یا اصل وجہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے پھر اس کو حاصل کیا جائے۔

مسئلے کی تیاری :

مسئلہ معمولی ہو یا غیر معمولی فریقین کی مرضی اور ذہنی تیاری سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو پہلے کوئی ایک فریق حملہ کرتا ہے اور دوسرا فریق فریق اول پر جوابی حملہ کرتا ہے۔ اس طرح دونوں فریق لڑائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے کشیدگی پیدا کرنے، فتح پانے یا ایک دوسرے کو بدنام کرنے کے بجائے فریقین آپس میں بات چیت کریں اور وجہ مخاصمت کو سمجھ کر اسے دور کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو بڑے سے بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دوستی اور دشمنی کا دارومدار باہمی آمادگی اور معاہدے پر ہوتا ہے۔ دوستی کا معاہدہ محبت سے اور دشمنی کا غصہ اور نفرت سے ہوتا ہے۔ بہر صورت فریقین کی آمادگی اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اس وقت تک لڑائی نہیں لڑ سکتی جب تک کہ دوسرا فریق لڑنے پر آمادہ نہ ہو جائے' یہی اصول دوستی کے لیے ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ فریقین کے درمیان معاہدے کے بغیر کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا تو یہ بھی ضرور ماننا پڑے گا کہ فریقین کی رضامندی سے ہر قسم کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں خوش گوار اور پرامن زندگی بسر کرنے اور اختلافات سے بچے رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو بدلنے کی بجائے خود اپنے کو بدلنے کی فکر کی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص خود کو بدلنے کا طریقہ سیکھنے کی کوشش کرے۔ جب کبھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو یہ سوچنا چاہیے کہ آپ اس کو حل کرنے کے لیے اپنی طرف سے کیا کر سکتے ہیں۔ جب فریقین یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے انھیں اپنی طرف سے مناسب قدم اٹھانا ہے تو مسئلہ خواہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔

بچوں کے ساتھ کام کرتے وقت یہ ضرور خیال رکھا جائے کہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور محبت اور شفقت کے ساتھ بات کر کے مسئلے کو حل کیا جائے۔

سمجھ کر ذمہ داری قبول کرنا

جب فریقین نیک نیتی کے ساتھ مل جل کر کسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل مانگا نہیں جاتا دیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر فریق کو دوسرے فریق کے ساتھ کام کرنے کے لیے خود ہی

آمادہ ہونا چاہیے اور یہ لین دین کا سودا نہایت خوبصورتی اور حسن سلوک سے کیا جائے۔ کسی مسئلے کو حل کرتے وقت فریقین کو نہایت آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرنا چاہیے۔ بچے کو خاص طور سے اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ البتہ یہ ضرور سمجھاتے رہنا چاہیے کہ کس صورت حال میں کس قسم کا فیصلہ مفید اور کار آمد ہوتا ہے۔

مسئلوں اور ان کے نتائج کی لمبی فہرست بن سکتی ہے اور کسی ایک مسئلہ کو مختلف طریقوں سے حل کیا جاسکتا ہے لیکن مذکورہ اصولوں کی روشنی میں مسئلے کو حل کرنے کے لیے والدین اور اساتذہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس صورتِ حال میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہم ان کی مدد کے لیے چند مثالیں دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لازمی نتائج پر مبنی طریقہ کس قدر مفید ہے اور اس طریقے کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان مثالوں میں بعض کی بنیاد ہمارے ذاتی تجربے ہیں اور بعض مشاہدے اور مطالعے کی بنا پر ہیں لیکن کوئی ایک مثال بھی فرضی یا خیالی نہیں ہے۔

مثالیں :

کون نہیں جانتا کہ ماں باپ اور بچوں کے درمیان صبح سے شام تک دسیوں مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض مسئلے عام ہوتے ہیں اور بعض خاص۔ لیکن ہر مسئلہ بڑوں اور بچوں کے ذہنی فرق اور بدگمانیوں کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ بعض مسئلے سوچے سمجھے ہوتے ہیں اور بعض چند گھریلو حالات کی وجہ سے وقتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً سویرے سو کر نہ اٹھنا۔ اسکول کے لیے جلدی تیار نہ ہونا۔ کھانے کے لیے خوشی خوشی رضامند نہ ہونا۔ کپڑے صاف نہ رکھنا۔ گھر کے کاموں میں والدین کا ہاتھ نہ بٹانا۔ گھر پر دیے ہوئے کام کو پورا نہ کرنا۔ اپنے کمرے کو صاف نہ رکھنا، غلط حرکتوں سے باز نہ آنا وغیرہ۔

زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ والدین اور بچوں یا استاد اور شاگردوں کے درمیان کشیدگی اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں کسی بھی صورتِ حال میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اکثر مسئلے والدین یا اساتذہ کی لاپرواہی۔ عدم توجہی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب بچے کو ماں باپ یا استاد کی محبت، توجہ اور قبولیت نہ ملنے کا احساس

ہو جاتا ہے تو وہ انھیں پریشان کرنے کے لیے طرح طرح کی ناپسندیدہ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ بے جا محبت اور توجہ ملنے پر بھی بچہ شرارت کرنے لگتا ہے مثلاً جب بچے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے کھانا نہ کھانے پر اس کی امی پریشان ہوں گی تو وہ کھانا کھانے سے انکار کرتا ہے اور بعض اوقات بھوکا مر جانے کی دھمکی دیتا ہے۔

سب بچوں کی شرارتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ عین ممکن ہے کہ کوئی بچہ کھانا نہ کھانے کے لیے روتا ہو اور کوئی بچہ زیادہ کھا کر اپنی والدہ کو پریشان کرے۔ کوئی بچہ دیر سے اٹھے اور کوئی بچہ والدین کو پریشان کرنے کی غرض سے بہت سویرے جاگ جائے۔ بعض بچے چھپ کر اور خاموشی کے ساتھ شرارتیں کرتے ہیں اور بعض کھلم کھلا اور اعلانیہ۔ بعض بچے والدین کو پریشان کرنے کے لیے خوف اور رقابت کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر مسئلے کو لازمی نتائج پر مبنی طریقے کے ذریعے حل کرنا چاہیے مثلاً سانپ سے کھیلنے والے بچے کو اس کے پاس سے اٹھا لینا اور سانپ کو مار بھگانا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے کاٹنے کا تریاق آسانی سے نہیں ملتا۔ اس کے کاٹنے سے جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ زندگی میں ایسے بہت سے تجربات ہو سکتے ہیں جن میں جان کا خطرہ رہتا ہے یا تندرستی خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے بچے کو ایسے تجربات سے روکا جائے جن کے ذریعے جسم و جان کے نقصان کا خطرہ ہو۔ یوں بھی جو تجربہ کرایا جائے اس میں بچے کی نگرانی اور حفاظت کا خیال رکھنا ہوتا ہے اور یہ احتیاط رکھنا ہوتی ہے کہ کشیدگی اور کشمکش کی صورت میں بے صبری اور جلد بازی سے کام نہ لیا جائے' اور بچے کے ساتھ بحث نہ کی جائے۔ خواہ مخواہ تو تو میں میں کرنے اور منہ زوری کرنے کا موقع دینے سے اس اصول کی خلاف ورزی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس میں فریقین کی عزت اور احترام پر زور دیا گیا ہے۔

دیر سے سو کر اٹھنا :

بہت سے گھروں میں صبح ہوتے ہی ماں اور بچے کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ ماں بچے کو جگانا چاہتی ہے اور بچہ سونا چاہتا ہے۔ ماں کبھی اسے بہکا پھسلا کر جگاتی ہے اور کبھی ڈرا دھمکا کر۔ اس صورتِ حال میں مسئلے کو حل کرتے وقت تمام بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے۔ ماں نے پہلے بچے کے ساتھ لڑائی شروع کی اور پھر خود ہتھیار ڈال کر خاموش

ہو گئی۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی ہے کہ بچے کو تھوڑی دیر اور سو لینے سے آرام ملے گا۔ رات دیر سے سویا ہو گا اس لیے سویرے جاگنے میں دیر کر رہا ہے۔ ماں اپنے بیٹے کے دیر تک سوتے رہنے کی اصل وجہ نہ سمجھ سکی۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ پائی کہ بیٹا اپنی اماں جان کی خدمت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے کروٹیں بدل رہا ہے۔ وہ جتنی مرتبہ اسے جگانے کی کوشش کرتی ہے اتنی ہی مرتبہ بچہ کروٹیں بدل کر مطمئن ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی طاقت اور اقتدار کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ ماں جگاتی ہے اور بیٹا سوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے میں وقت پر جاگنے کی عادت کس طرح پیدا کرائی جائے۔

ہمیں ذرا دیر کے لیے والدین اور بچے کے درمیان معاہدے اور تعلق پر غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس جنگ یا کشمکش میں کس کی جیت ہوتی ہے اور کون ہارتا ہے۔ یہ جنگ شروع ہی ہوتی ہے قوت آزمائی اور زور دکھانے کے لیے۔ بالآخر دونوں فریق کو برابر برابر حصہ ملتا ہے پہلے بچے کو کامیابی حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ماں کے پیار کرنے، ڈرانے دھمکانے کے باوجود بستر نہیں چھوڑتا اور پھر ماں اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب بچہ آنکھیں ملتا ہوا بستر چھوڑ کر اس کے پاس آبیٹھتا ہے۔ بچے کو جگانے کے لیے یہ طریقہ عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے۔ دونوں فریق یعنی ماں اور بیٹا یہ جانتے ہیں کہ ہار جیت کا یہ مقابلہ روزانہ جاری رہتا ہے۔ ماں جگاتی ہے اور بچہ کروٹیں بدلتا ہے اور اس صورتِ حال میں یہی باہمی معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں باہمی مشورے اور ذمہ داری کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ماں نے خود یہ سمجھ رکھا ہے کہ بیٹے کو وقت پر جگانا اس کی ذمہ داری ہے۔ بڑا ہو کر بچہ خود بخود جاگنے لگے گا۔

اس مسئلے کا حل بہت آسان ہے بشرطیکہ اس کو ان چاروں بنیادی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی جائے جو لازمی نتائج پر مبنی طریقے کے استعمال میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یک طرفہ لڑائی شروع کرنے اور پھر خود بخود رعایت کرنے سے بچنے کے لیے والدین کو بچے کی طرف سے تھوڑی بے رخی اور لاپروائی سے کام لینا چاہیے۔ انھیں بچے کو زبردستی جگانے کی کوشش کے بجائے یہ سمجھنے کا موقع دینا چاہیے کہ دیر تک سوتے رہنے سے وقت پر مدرسے پہنچنے میں کیا پریشانی ہوتی ہے۔ اسے یہ فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہیے کہ دیر تک سوتے رہنا اچھا ہے یا وقت پر مدرسے پہنچنا بہتر ہے۔ ظاہر ہے بچہ وقت پر اسکول پہنچنا پسند

کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد والدین کو بچے کو جگانے کی ذمہ داری سے دست بردار ہو کر اسے یہ محسوس کرانا چاہیے کہ وہ وقت پر اٹھنے کے لیے خود ذمہ دار ہے اور اگر اسکول جانے میں دیر ہو گی تو اس کے نتائج اسے خود ہی بھگتنے ہوں گے۔

اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس طرح کیا فرق پڑتا ہے کہ بچہ خود جاگے یا اس کی ماں اسے جگائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر باہمی مشورے سے یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ ماں بچے کو جگانے کی ذمے دار نہیں رہے گی اور وہ اس کو جگانے کی مہم میں شریک نہیں ہو گی تو اس کے اور بچے کے درمیان کسی قسم کی غلط فہمی اور کشیدگی نہیں پیدا ہو سکے گی۔ بچہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے گا اور وقت پر جاگ جانے کی عادت پیدا کر سکے گا۔ اسے اس صورتِ حال میں یہ سیکھنے کا موقع ملے گا کہ وقت کی پابندی سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور وقت پر بیدار ہونے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح بچہ سیکھ سکے گا کہ اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا ہوتا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے حتی الوسع خود ہی کوشش کرنا ہوتی ہے۔

جب والدین گھر کا ہر کام خود ہی کرنے لگتے ہیں اور بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے کام خود ہی کرے تو کبھی کبھی والدین اور بچے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بچے کی عادت ہوتی ہے کہ جب تک والدین سامنے رہتے ہیں وہ ان سے اپنا کام کراتا ہے' اس طرح اسے دوسروں سے مدد لینے اور دوسروں کا سہارا تکنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ والدین سے کس طرح کام لیا جاتا ہے وہ خود اسی وقت اپنا کام اپنے آپ کرتا ہے جب یہ سمجھ جاتا ہے کہ والدین اس کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے ہیں۔ مثلاً بچے کو جگانے کے سلسلے میں آپ الارم کلاک لا کر دے دیں اور اس سے یہ امید رکھیں کہ وہ الارم کی آواز پر فوراً جاگ جائے گا تو آپ کی یہ امید اس وقت تک پوری نہ ہو سکے گی جب تک آپ اس کی طرف سے بالکل بے تعلق نہ ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ بچہ اسکول دیر سے پہنچنے کے لیے دیر تک نہیں سوتا ہے بلکہ والدین کی توجہ حاصل کرنے اور اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ بچے کو جگانے اور اس میں احساس ذمہ داری پیدا کرانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اسے یہ نہ محسوس کرا دیں کہ وقت پر اٹھنا خود اس کی ذمہ داری ہوتی ہے مثلاً :

ایک لڑکا احسن چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کی عادت تھی روزانہ دیر سے اٹھنے کی۔

تیسری مثال :

یہ مثال اس اعتبار سے قابل غور ہے کہ بچوں کے کردار کو بدلنے اور عادتوں کے بنانے میں مناسب ہمت افزائی اور اشتراکِ عمل سے بڑی مدد ملتی ہے۔ میں نے اپنی بوا کے لڑکے رشید کو جس کی عمر ۶ سال ہے اوکھلا پرائمری اسکول میں داخل کرایا۔ یہ اسکول سہ پہر میں لگتا ہے۔ بواروزانہ یہ کوشش کرتی کہ رشید کھانا کھا کر وقت پر مدرسے پہنچ جائے۔ اس کے برعکس رشید کی یہ کوشش ہوتی کہ جتنی دیر کر سکے کرے اور بھاگتا دوڑتا دیر سویر مدرسے پہنچ جائے۔ بوا کے کہنے پر میں نے رشید سے بات چیت کی اور ایک خوبصورت ٹائم پیس (الارم کلاک) لاکر رشید کو دیا اور اس کی سوئیوں کو گھما کر یہ سمجھایا کہ جب گھڑی کی سوئیاں اس طرح ہوں گی تو تمھارے کھانے اور پھر مدرسے جانے کا وقت ہو جائے گا۔ تم گھڑی دیکھ کر کام کرنا اور وقت پر مدرسے جایا کرنا۔ رشید میری ہدایت اور مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے اور بوا نے اس کے مدرسے جانے کی تیاری میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ ہم دونوں بظاہر اس معاملے میں بالکل بے تعلق اور غیر جانبدار ہو گئے۔ لیکن میں نے مدرسے کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور استاد جماعت سے مل کر رشید کی عادت کا ذکر کیا اور اس عادت کو دور کرنے میں ان کی مدد چاہی۔ میری اس ملاقات کا رشید کو بالکل پتا نہ چلا۔

دوسرے دن جب رشید تقریباً بیس منٹ دیر سے اسکول پہنچا تو استاد جماعت نے اسے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے رشید کو وقت پر آنے کی تاکید کی اور ایک بند لفافہ رشید کے ہاتھ میرے پاس بھیجا۔ رشید نے وہ لفافہ مجھے لاکر دیا۔ میں نے اس کی موجودگی ہی میں ہیڈ ماسٹر صاحب کا خط پڑھ کر رشید سے کہا کہ تمھارے دیر سے اسکول پہنچنے کی شکایت کی گئی ہے۔ اب بتایئے میں کیا جواب دوں اور کیا کروں! تم مدرسے وقت پر جاتے تو مجھے یہ خط نہ ملتا۔ افسوس ہے میاں رشید تم اچھے بچے ہو۔ ٹائم پیس تمھارے پاس ہے۔ اس کو استعمال کرو اور مدرسے وقت پر پہنچنے کی کوشش کیا کرو۔ ہماری درپردہ محبت اور لاپروائی کارگر ثابت ہوئی۔ رشید نے اپنی عادت بدلنا شروع کی۔ اس موقع پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی بے تعلقی اور غیر جانبداری کا اظہار کرتے وقت یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ وہ واقعی بے تعلق اور غیر جانب دار رہ سکیں گے یا نہیں۔ محض کہنے سے اور ظاہر داری سے بات نہیں بنتی۔ بچوں میں والدین کی نیت سمجھنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ

والدین غصے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ وہ یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ والدین کی اکثر دھمکیاں محض وقتی اور صرف دھمکیاں ہوتی ہیں۔

چوتھی مثال :

ہمارے ایک دوست کی بیٹی سدھا دہلی پبلک اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیرہ برس تھی۔ وہ اپنی امی کو روزانہ پریشان کرتی تھی۔ جب دیکھیے دوڑ بھاگ کر مقررہ وقت کے آخری سیکنڈ پر اسکول بس پکڑ پاتی تھی۔ صبح الارم کی آواز پر سویرے اٹھ جاتی تھی لیکن کپڑے بدلنے' بال بنانے' اور ناشتہ کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتی تھی۔ اس کی امی بس کے آنے کا وقت یاد دلاتی رہتی تھی لیکن اس کو پروانہ ہوتی۔ جب کبھی بس نہ ملتی تو اس کے والد اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر سدھا کو اسکول چھوڑ آتے تھے۔ سدھا کے والدین اس کی سستی اور لاپروائی سے تنگ آچکے تھے۔ ایک روز سردی کا موسم تھا۔ خوب سردی پڑ رہی تھی۔ سدھا کو اسکول کی بس نہ مل سکی۔ منہ لٹکائے گھر واپس آئی تو اس کے والد نے نہایت اطمینان اور پیار سے کہا سدھا! آج تو تمھیں پیدل ہی اسکول جانا پڑے گا یا ڈی۔ ٹی۔ سی کی بس مل جائے تو اس سے چلی جانا۔ میں اس سردی میں موٹر سائکل نہیں چلاؤں گا' یوں بھی آج میری طبیعت اچھی نہیں۔ اس روز سدھا کا کوئی امتحان بھی ہونے والا تھا۔ سدھا ہانپتی کانپتی ڈی۔ ٹی۔ سی بس کے ذریعے اسکول پہنچی۔ جب سہ پہر میں اسکول سے گھر واپس آئی۔ تو سدھا کی امی نے صرف یہ دریافت کیا کہ ٹیسٹ کیسا رہا۔ جواب ملا کہ اچھا ہی ہو گیا ہے۔ اس تجربے کے بعد سدھا نے مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی اسکول بس کے اسٹینڈ پر جانا شروع کر دیا۔

سدھا کو جب تک اپنے والد کا سہارا ملتا رہا وہ اپنی دلچسپی کے مطابق تیاری میں وقت صرف کرتی رہی۔ اس پر اپنے والدین کی خفگی کا کوئی اثر نہ ہوا بالآخر والد کی ایک روز کی سچی غیر جانبداری اور بے تعلقی نے سدھا کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے علاوہ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ والدین نے سدھا کی عزت کا خیال رکھا اور جو کچھ کہا اُسے سنجیدگی متانت اور محبت کے ساتھ کہا۔ انھوں نے سدھا کو اپنے رویہ کا نتیجہ بھگتنے کا صحیح موقع دیا۔ اگر وہ سدھا کے ساتھ غصے کے ساتھ پیش آتے یا تحکمانہ انداز میں اسکول جانے پر مجبور کرتے تو ان کا یہ رویہ سزا کا مترادف سمجھا جاتا۔

دراصل لازمی نتائج پر مبنی طریقے کو اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق جمہوری انداز میں استعمال کرنے سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کو ہر صورتِ حال میں بچے کے جذبات اور شخصیت کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی صورتِ حال پیش آئے اس میں بچے کو خود سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس طریقے کو استعمال کرنے والے بچے کو بے بنیاد بحث و مباحثہ کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اچھا یہ ہے کہ ماں باپ یا استاد جو فیصلہ کریں وہ باہمی مشورے سے ہو اور اس کے ذریعے بچے میں ذمے داری کا احساس پیدا کرایا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ بچے کو بیماری کی حالت کے علاوہ کبھی کسی اور وجہ سے مدرسے جانے سے نہ روکا جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ بچوں کے لیے اپنی حیثیت اور مذاق کے مطابق مختلف قسم کے کھلونے اور کپڑے لاتے رہتے ہیں لیکن انھیں ٹھیک سے استعمال کرنے اور سلیقے کے ساتھ مقررہ جگہ پر رکھنے کی عادت پیدا نہیں کراتے۔ جب بچہ اپنے کھلونوں اور کپڑوں کو استعمال کے بعد ادھر ادھر پڑا چھوڑ دیتا ہے تو ماں باپ کو بالخصوص ماں کو پریشانی ہوتی ہے اور زیادہ پریشانی ہونے کی صورت میں بچے کو مارنا پیٹنا اور ڈرانا دھمکانا شروع کر دیتی ہے۔ ڈسپلن کی تربیت کا یہ طریقہ بالکل نامناسب سمجھا جاتا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ بچے کو شروع ہی سے باقاعدگی، خوش مذاقی اور صفائی کی تعلیم دی جائے۔ اس قسم کی تعلیم کے لیے پروفیسر ہربارٹ اسپینسر (۱۸۲۰ تا ۱۹۰۳ء) کے طریقے کا استعمال جو لازمی نتیجے پر مبنی کہلاتا ہے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم نے جامعہ مڈل اسکول کے بورڈنگ میں بحیثیت اتالیق اس طریقے کو استعمال کیا ہے اور اس کے استعمال سے بچوں میں اپنی ضرورت کی چیزوں کی حفاظت کرنے اور اُنھیں استعمال کے بعد مقررہ جگہوں پر رکھنے کی عادت پیدا کرائی گئی ہم نے اس طریقے کو اپنے گھر کے بچوں کی تربیت میں بھی آزمایا ہے اور نتیجے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

جب آپ یہ دیکھیں کہ بچہ اپنے کھلونوں اور کھیل کے سامان کو استعمال کرنے کے بعد مقررہ جگہ پر رکھنے کے بجائے ادھر ادھر پڑا چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں لگ جاتا ہے تو اس پر نہ تو خفا ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے ڈانٹنا دھمکانا چاہیے بلکہ نہایت خاموشی سے ان کھلونوں کو اٹھا کر اپنی نگرانی میں کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں سے وہ خود نہ اٹھا سکے۔ جس وقت کھیلنے کا خواہش مند ہو اور آپ سے اپنے کھلونے طلب کرے تب آپ نہایت متانت اور سنجیدگی سے یہ کہہ دیں

"میاں! تم کھیلنے کے بعد ان کھلونوں کو ادھر ادھر پڑا چھوڑ دیتے ہو۔ ہم تمہارے لیے انھیں اٹھا اٹھا کر حفاظت سے رکھتے رہتے ہیں۔ بس اب تم ان سے کھیلنا چھوڑ دو۔ ہم کہاں تک ان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" ظاہر ہے بچہ کھلونے حاصل کرنے کے لیے اصرار کرے گا۔ آپ یہ کہہ کر کھلونے دے سکتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنا کام خود ہی کرنا چاہیے۔ کھلونوں کی حفاظت کرنا تمھاری ذمہ داری ہے نہ کہ ہماری۔ اس طرح بات چیت کرنے اور سمجھانے سے بچوں میں اپنے کھلونوں کی حفاظت کرنے اور سلیقے کے ساتھ مقررہ جگہ پر رکھنے کی عادت پیدا ہو سکتی ہے۔

یوں تو بچوں کو سلیقے کے ساتھ کام کرنا سکھانے کے لیے بہت سے طریقے استعمال ہوتے ہیں لیکن لازمی نتائج پر مبنی طریقے کا استعمال زیادہ مفید اور کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بچے کی نفسیات کے مطابق ہے۔ اگر اس طریقے کو ذرا محبت، عزت اور حسنِ سلوک سے استعمال کیا جائے تو بچوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ مسائل زندگی کو حل کرنا سیکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ مڈل اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بورڈنگوں سے متعلق تمام اتالیق صاحبان نے طلبہ کے نمایندوں کے مشورے سے یہ طے کیا کہ ہر ہفتے سنیچر کی شام میں بورڈنگ کی عام صفائی کا کام کیا جائے یعنی سنیچر کی شام صفائی کے کاموں کے لیے وقف ہوگی۔ جب اس فیصلے پر عمل ہوا تو اس کے عیب و ثواب کا اندازہ ہو سکا۔ دیکھیے درج ذیل مثال :

سنیچر کی صبح ہی سے شور مچ جاتا تھا کہ آج صفائی کا کام ہوگا۔ سب کے سب دوپہر کے آرام کے بعد صفائی کرم چاریوں کی طرح کام کریں گے۔ جب صفائی کا کام شروع ہوا تو رحمت علی متعلم درجہ ششم بہت دیر تک اپنے بستر پر پڑا رہتا اور جب اٹھتا تو فوراً باہر جا کر کھیلنے کودنے لگتا۔ جب صفائی مانیٹر نے رحمت علی کے رویے کی رپورٹ کی تو میں نے رحمت علی سے معلوم کرنا چاہا کہ وہ بورڈنگ کی صفائی کے کاموں میں کیوں نہیں حصہ لیتا۔ لیکن اس کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی دوسرا جواب نہ تھا۔ میں نے کہا اچھا بیٹے تمھارا جو جی چاہے کرو۔ ہم تمھیں مجبور کر کے صفائی کے کام میں لگانا نہیں چاہتے۔ رحمت علی خوش ہو کر واپس چلا گیا۔ لیکن آیندہ ہفتے سے خود ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صفائی کے کاموں میں حصہ لینے لگا۔ اس طرح صرف بات چیت کرنے سے رحمت علی کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پورے ہفتے کمروں کو گندہ رکھ کر صرف سنیچر کی شام

میں انھیں صاف کیا جائے' آخر ایسا کیوں ہے۔ صفائی کا خیال تو ہر وقت رکھنا ہوتا ہے۔ اور اُسی سے بچوں میں صاف رہنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ صفائی کا ہر وقت خیال رکھا جائے اور استعمال کی چیزوں کو استعمال کے بعد مقررہ جگھوں پر رکھا جائے۔ بچوں کو بتایا جائے کہ جو چیز اپنی جگہ پر نہ ملے اسے کوڑا کرکٹ سمجھ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔

ایک لڑکا تھا عمران جس کی عمر ۱۲ سال تھی وہ ناشتہ کے لیے ڈائننگ ہال میں ہمیشہ دیر سے جاتا تھا۔ وہ ہر دوسرے روز استعمال شدہ کپڑوں کو توشہ خانے میں ادھر ادھر ڈال کر بکس سے دُھلے کپڑے نکال لیتا تھا۔ میں تمام طلبہ کو کئی بار یہ سمجھا چکا تھا کہ کپڑے بدلنے کے بعد انھیں صاف رکھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور بورڈنگ کے تمام لڑکوں کو مقررہ دنوں میں کپڑے بدلنا چاہیے۔ یہ بھی سمجھایا جا چکا تھا کہ استعمال شدہ کپڑوں کو گندے کپڑوں کے تھیلے میں ڈالا جائے۔ لیکن میرے کہنے اور سمجھانے کا عمران پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں مجبوراً خاموش ہو گیا اور دھوبی کو چپکے سے یہ کہلا بھیجا کہ اس مرتبہ دُھلے کپڑے ذرا دیر سے لائے۔ اس طرح ایک روز یہ نوبت آئی کہ عمران کے بکس میں ایک بھی دُھلا ہوا جوڑا نہ تھا اور بدن پر جو کپڑے تھے وہ بہت گندے معلوم ہو رہے تھے۔ عمران پریشان ہو کر دھوبی کی شکایت کرنے کے لیے میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ دھوبی آیا نہیں اور میرے سب کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا "اور سب بچوں کے پاس تو دھلے کپڑوں کے کئی کئی جوڑے رکھے ہیں۔ تمھارے پاس کیوں نہیں ہیں"۔ عمران خاموش ہوئے اور کچھ شرمندہ بھی۔ انھیں معلوم تھا کہ بورڈنگ میں ہر لڑکے کے پاس یکساں تعداد میں کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ واپس جا کر عمران نے ایک دو جوڑے کپڑے خود ہی دھوئے اور پھر ان کو پہنا۔ اس کے بعد عمران نے سب بچوں کی طرح اپنے کپڑوں کو صاف رکھنے کی کوشش کی۔

جو والدین یا اساتذہ لازمی نتائج پر مبنی طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ اپنے بچوں میں بڑی حد تک شروع ہی سے سوچ سمجھ کر کام کرنے اور ذمہ داری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی عادت پیدا کرا دیتے ہیں۔ اس طریقے کے استعمال میں یہ ضرور خیال رکھنا ہوتا ہے کہ بچے کے ساتھ کسی بھی صورتِ حال میں تو تو میں میں نہ کی جائے جیسا کہ اوپر کی مثال میں صاف طور سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اتالیق صاحب عمران کے رویے کو اس وقت تک برداشت کرتے رہے جب تک اس کے کپڑوں کا بکس خالی نہ ہو گیا اور عمران کو اپنی پریشانی کا احساس نہ ہوا۔ اس

نے اپنے رویے کے نتائج کو سمجھا اور اتالیق صاحب نے صبر و تحمل اور حسنِ تدبیر سے کام لے کر عمران کو مقررہ قاعدے پر عمل کرنے کا سبق سکھایا۔

ایک سال مجھے چوتھی جماعت کے طلبہ کے ساتھ بحیثیت اتالیق کام کرنا پڑا۔ بورڈنگ میں توشہ خانے کو صاف اور باقاعدہ رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں نے سال شروع ہوتے ہی تمام لڑکوں سے علاحدہ علاحدہ ملاقات کی۔ سب کی دلچسپیوں اور سماجی پس منظر کو جاننے کی کوشش کی۔ پھر رفتہ رفتہ سب بچوں کی عادتوں اور رویوں کا مشاہدہ کیا۔ تقریباً ایک ماہ گزر جانے کے بعد بورڈنگ کے طلبہ کا جلسہ کیا۔ جس میں توشہ خانے' مطالعے کے کمرے اور سونے کے کمروں کی صفائی اور باقاعدگی کے متعلق بات چیت کی گئی۔ مختلف کاموں کے لیے مانیٹروں کا انتخاب ہوا۔ لیکن بچوں کے رہن سہن کے طریقے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جگہ جگہ کاپیاں کتابیں' ٹوپیاں اور جوتیاں پڑی ملتی تھیں۔ ایک روز پھر طلبہ کا جلسہ کیا گیا اور ان تمام مسئلوں پر بات چیت کی گئی۔ بڑے غور و خوض کے بعد طے پایا کہ روزانہ سونے سے قبل ہر ایک لڑکا اپنے سامان کا جائزہ لے گا۔ دیکھے گا کہ اس کی کوئی چیز ادھر ادھر تو پڑی نہیں رہ گئی ہے۔ اگر دن کے وقت یا رات کے وقت کسی کی کوئی چیز ادھر ادھر پڑی ملی تو آرایش اور صفائی کا مانیٹر اسے اٹھا کر اتالیق صاحب کے کمرے میں رکھے گئے گتے کے بکس میں رکھ دیں گے اور اس ڈبے میں جو چیز رکھ دی جائے گی وہ آیندہ ہفتے واری جلسے کے وقت تمام طلبہ اور اتالیق صاحب کی موجودگی میں اس کے مالک کو دی جائے گی۔ اس فیصلے کی وجہ سے طلبہ میں عام طور سے اپنی چیزوں کی حفاظت کرنے اور اُنھیں مقررہ جگہ پر رکھ کر بورڈنگ کو صاف ستھرا رکھنے کی عادت پیدا ہو گئی۔

ایک اور دلچسپ مثال لیجیے۔ اس مثال کی روشنی میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ہر طرح کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ بچے عام طور سے بڑے فعال اور جدت پسند ہوتے ہیں۔ ہمارے بورڈنگ میں لڑکوں نے ایک دوسرے کے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ طلبہ کے ہفتہ واری جلسے میں طے پایا کہ توشہ خانے کو اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ چار چار لڑکوں کے لیے کپڑے ٹانگنے کا ایک اسٹینڈ ہو اور وہ چاروں لڑکے توشہ خانے کے اتنے حصے کو صاف رکھنے کے لیے ذمہ دار قرار دیے جائیں جس میں ان کا اسٹینڈ اور بکس رکھے ہوں گے۔ چنانچہ پورا توشہ خانہ اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ ہر چار طلبہ کو توشہ خانے کا ایک حصہ مل گیا اور ہر ایک طالب علم کے لیے کپڑے ٹانگنے' جوتے رکھنے' بکس رکھنے اور کتابیں رکھنے کی جگہ مقرر

ہو گئی۔ اسی جلسے میں یہ بھی طے پایا تھا کہ جو چیز ادھر ادھر پڑی ملے گی اسے اتالیق صاحب کے کمرے میں رکھے گتے کے ڈبے میں رکھ دیا جائے گا اور وہ چیز اس کے مالک کو اس وقت واپس کی جائے گی جب اس کے ایک ہفتے کے جیب خرچ کے مساوی رقم پکنک فنڈ میں جمع کر دی جائے گی گویا کہ اپنی چیزوں کو ادھر ادھر ڈال دینے والے لڑکے کو ایک ہفتے کے جیب خرچ سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہفتے واری جلسے میں کیے گئے فیصلے کے مطابق کام کرنے سے بورڈنگ ہاؤس میں صفائی رہنے لگی اور توشہ خانے میں ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر رکھی ہوئی ملنے لگی۔

ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے' دیکھیے کہ اس میں اور مذکورہ بالا مثالوں میں کیا فرق ہے اکثر بچے گندے کپڑے اتار کر بری طرح پھینک دیتے ہیں۔ کسی کی جیب میں کچھ پڑا رہ جاتا ہے۔ کسی کی قمیص اور کرتے کے بٹن لگے رہ جاتے ہیں۔ کسی کا کرتا الٹا ہوتا ہے اور کسی کا پائجامہ اُلٹا ہوتا ہے۔ کپڑوں کو اس حالت میں دیکھ کر دھوبی منہ بناتا ہے اور ماؤں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مجبوراً ماں جان کی طرف سے حکم صادر ہوتا ہے کہ جو کپڑا صحیح حالت میں نہیں ڈالا جائے گا وہ دھوبی کو نہیں دیا جائے گا اور جس کا کپڑا ہو گا اسے وہ خود دھو کر پہنے گا۔ اس طرح حکم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا حکم نتائج پر مبنی طریقے کی جان نکال لیتا ہے۔ اگر اماں جان یہ کہیں کہ بھیا دھوبی بھی تمھاری طرح آدمی ہے۔ وہ تمھارا مددگار ہے۔ تمھیں بھی اس کی مدد کرنا چاہیے۔ اس طرح کپڑوں کو الٹے سیدھے طریقے سے ڈالنے سے اسے انھیں ٹھیک کرنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ اس کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ تم کو خود دیکھ کر اپنے کپڑوں کو گندے کپڑوں میں ڈالنا چاہیے۔ اس طرح کی ہدایت یا مشورے کا بچے پر حکم کے مقابلے میں اچھا اثر ہوتا ہے۔

جب کوئی بچہ اپنی چیزوں کو ادھر ادھر پھینکے اور ماں باپ یا استاد کی ہدایت پر عمل نہ کرے تو سمجھیے کہ وہ اپنے دبے ہوئے جذبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں والدین یا اساتذہ کو بالکل بے رخی' بے تعلقی اور غیر جانبداری کا اظہار کرنا چاہیے اور بچے کے رویے کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہنا چاہیے۔ حتی الامکان غصے کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ غصے کا جواب غصے سے دینے سے بچے کے اندر ضد اور لاپروائی کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔

میرے چھوٹے بھائی کے دو لڑکیاں ہیں۔ عائشہ اور ندا۔ عائشہ چار سال کی ہے اور ندا تقریباً ساڑھے پانچ برس کی۔ ایک روز یہ دونوں بچیاں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں "گڑیا گھر"

کھیل رہی تھیں اور برابر کے کمرے میں ان کے بڑے بھائی T.V. پروگرام دیکھ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں بچیوں کے کھیل کا سامان پھیلا پڑا تھا۔ بچیوں کی امی نے ڈرائنگ روم کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ کا اظہار کیا اور فرمایا 'اگر کھیل ختم ہونے کے بعد مجھے تمھاری کوئی چیز یہاں پڑی دکھائی دی تو اچھا نہ ہوگا۔ بچیوں نے جواب دیا کہ امی ہم اپنا سامان ضرور اٹھالیں گے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بچیاں "گڑیا گھر" کھیل سے متعلق پورا سامان ڈرائنگ روم میں پڑا چھوڑ کر TV دیکھنے لگیں جب ان کی امی نے ڈرائنگ روم دیکھا تو آگ بگولا ہو گئیں اور بچیوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ T.V. دیکھ کر ڈرائنگ روم صاف کر دیں گے لیکن جیسے ہی TV پروگرام ختم ہوا دونوں بچیاں اپنے کمرے میں جا کر تصویروں کا البم دیکھنے لگیں۔ یہ دیکھ کر امی جان بے حد خفا ہوئیں اور دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ڈرائنگ روم صاف کرنے کے لیے پکڑ لائیں۔ بچیوں نے جیسے تیسے ڈرائنگ روم کی صفائی کی اور ان کی امی جان خفا ہو کر ایک طرف بیٹھی رہیں۔

اس مثال میں مشترکہ فیصلے شخصی ذمے داری اور باہمی عزت کو کوئی دخل نہیں۔ ماں نے بچیوں کی توہین کی۔ اگر ماں بچیوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے کے بجائے خود بھی ڈرائنگ روم کی صفائی کے کام میں بچیوں کے ساتھ شریک ہو جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ان بچیوں سے کہہ سکتی تھی کہ کیا کھیل کے بعد ڈرائنگ روم اسی حالت میں چھوڑا جائے گا۔ نافرمانی کی عادت کی اصلاح کے لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ والدین صورتِ حال کو دیکھ کر مناسب انداز میں بے تعلقی اور غیر جانبداری کا اظہار کریں۔ عائشہ اور ندا کے معاملے میں ان کو ڈسپلن کی تربیت دینے کے لیے بہتر ہوتا کہ ماں دونوں بچیوں کو پیار کے ساتھ ڈرائنگ روم کو صاف رکھنے کی ضرورت سمجھا دیتی اور ان کے ساتھ کھیل کا سامان اٹھانے میں لگ جاتی اور پھر ہر چیز کو سلیقے سے اس کی مقررہ جگہ پر رکھوانے میں بچیوں کی مدد کرتی۔ اس طرح بچیوں کو ماں کی محبت اور اپنی عزت کا احساس ہوتا اور وہ اپنی ذمے داری کو محسوس کرتیں۔ ڈرائنگ روم کی صفائی کا کام T.V. دیکھنے کے فوراً بعد کرالیا جاتا تو اچھا تھا۔

عام طور سے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کام کی ذمے داری والدین خود ہی پورا کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ آج کے بچے کل کے شہری ہوتے ہیں۔ انھیں شروع ہی سے ذمے داریاں قبول کرنا سکھانا چاہیے تاکہ وہ ان کو اچھی طرح پورا کریں اور اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون کا سبق سیکھ کر اچھے سماجی انسان بنیں۔ والدین کے اس قسم کے رویے کی وجہ سے بچے

بے فکر ہو جاتے ہیں اور لاپروا بھی۔ وہ گھر کے کسی کام کو اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے۔ انھیں وقت کی قیمت، محنت کے نتیجے اور روپیہ پیسہ کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ زمانۂ قدیم میں لڑکا باپ کے لیے اور لڑکی ماں کے لیے مددگار اور معاون سمجھی جاتی تھی۔ اب ٹیکنالوجی اور سائنس کے دور میں ہر کام کے لیے مشین ایجاد ہو رہی ہے۔ اس لیے گھر میں بچے سے کام کرانے کے مواقع کچھ کم ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اکثر والدین تعلیم حاصل کرنے والے بچے سے کام کرانے میں تکلف کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کام کی وجہ سے تعلیم کا نقصان ہوتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ اس طرح گھوم پھر کر گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمے داری صرف ماں کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے۔ وہ خود کرے یا ملازمہ سے کرائے۔ ماں بچوں سے گھر میں کام نہیں لیتی اور بچے گھر میں کام کرنا اور والدین کا ہاتھ بٹانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ان میں یہ احساس ہی نہیں پیدا ہوتا کہ دو ہاتھوں کے مقابلے میں چار ہاتھوں سے کام زیادہ آسانی اور خوش اسلوبی سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کو ہاتھ سے کام کرنے کا شوق کس طرح دلایا جائے اور انھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ کوئی کام صرف باتوں سے نہیں بلکہ کرنے سے آتا ہے۔ درج ذیل مثال میں بتایا گیا ہے کہ گھر میں باقاعدگی اور باسلیقہ رہنے سے گھر کے ہر رکن کو کس طرح سکون اور آرام مل سکتا ہے اور مشترکہ ذمے داریوں کو پورا کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔

۱۲ برس کا صغیر علی نہ صرف یہ کہ اپنی چیزوں کو ادھر ادھر پھینکتا رہتا تھا اور اپنے کمرے کو بھی بے حد گندہ رکھتا تھا بلکہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اس کے والد نے اپنی بیوی اور بچیوں کے مشورے سے گھر کے جملہ اراکین کو جمع کیا اور طے کیا کہ گھریلو مسئلوں کو طے کرنے کے لیے ہر مہینے کی آخری اتوار کو ایک جلسہ ہوا کرے گا۔ ایک جلسے میں جس کی صدارت صغیر علی کر رہے تھے یہ طے کیا گیا کہ گھر کے کس کام کو پہلی تاریخ سے کون کرے گا۔ صغیر علی کے ذمے کچن کی کچرے سے بھری ٹوکری یا تھیلے کو صاف کرنے کا کام طے پایا۔ جب ٹوکری کو باہر لے جا کر صاف کرنے کا وقت آیا تو صغیر علی بگڑ گئے اور کہنے لگے "میں کوڑے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ گندہ کام ہے۔ میں گندہ کام کیوں کروں۔" صغیر علی کی یہ جذباتی حالت دیکھ کر اس کی امی خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب صغیر علی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو امی جان نے سمجھایا "بیٹا کچن کی ٹوکری صاف کرنے کی ذمہ داری تم نے خود ہی تو قبول

کی تھی۔ اگر ہم تم سے کسی چیز کا وعدہ کرنے کے بعد وہ چیز تمھیں نہ دیں تو تم کو کیسا محسوس ہوگا"۔ یہ سن کر صغیر علی کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے مجھے غصہ آئے گا اور افسوس ہوگا۔ لیکن میں ٹوکری صاف کرنے کا کام نہیں کروں گا۔ اس پر صغیر علی کی امی نے کہا کہ ٹھیک ہے تم آزاد ہو۔ تمھارا جو جی چاہے کرو۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے اور نہ ہی تم ہم سے کچھ کہو گے۔ بس خوش رہو۔ تم اور ہم دونوں اپنی اپنی مرضی کے مطابق رہیں اور کام کریں تو اچھا ہے۔ امی کی یہ بات سن کر صغیر علی کے کان کھڑے ہوئے اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور امی اپنی بیٹی کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

دوسرے دن صغیر علی کھانے کی میز پر ناشتہ کرنے کی غرض سے آیا تو میز پر کچھ نہ پا کر سخت پریشان ہوا، دوڑا دوڑا اپنی امی جان کے پاس گیا۔ کچھ خفا اور کچھ شرمندہ۔ ناشتہ نہ ملنے کی شکایت کے جواب میں اس کی امی یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں "میں اپنا ناشتہ کر چکی ہوں اب ذرا دیر کے لیے اخبار پڑھنا چاہتی ہوں" امی کا یہ جواب سن کر صغیر علی کو محسوس ہوا کہ کل شام جو آزادی ملی تھی یہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہی صورتِ حال دوپہر کے کھانے کے وقت پیش آئی۔ دریافت کرنے پر صغیر علی کی امی نے بتایا کہ انھیں آج دوپہر اپنی ایک سہیلی کے گھر جانا ضروری ہے اور رات میں کچھ دیر سے واپسی ہوگی۔ سیدہ (صغیر کی بہن) بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ صغیر علی کی والدہ نے اس کا کوئی اور کام بھی نہیں کیا تھا۔ جب آئندہ اتوار کو ماہانہ جلسہ ہوا تو کاموں کی پوری روداد سنائی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ کچن کی ٹوکری صغیر علی نہیں بلکہ والدہ صاحبہ صاف کرتی رہی ہیں۔ نہایت غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ گھر کے کاموں میں خاندان کے ہر فرد کو حصہ لینا ہوگا اور جس کے نام جو کام لکھا جائے گا وہ اسے ذمے داری سے کرے گا۔ اب صغیر علی نے خود اپنی مرضی سے ٹوکری صاف کرنے کا کام اپنے ذمے لیا اور اسے پابندی سے پورا بھی کرتا رہا۔

در اصل مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو اسے جمہوری طریقے سے حل کر لینے سے فریقین کو تسکین ہوتی ہے۔ ڈسپلن کی تربیت کے خیال سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بچے کی تربیت میں شروع ہی سے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ خانگی امور کی ذمہ داریاں تمام اراکین خاندان میں تقسیم کر دی جائیں اور بچوں سے ان ذمے داریوں کو بحسن و خوبی پورا کرایا جائے۔ اس طرح اُنھیں کام کی اہمیت اور کام کرنے والوں کی عزت کرنا آئے گی اور وہ خود خوش ہو کر کام

کرنا سیکھیں گے۔ اس کے علاوہ بعض اخلاقی خرابیوں مثلاً ضد کرنا' سوتے ہوئے پیشاب کر لینا' چوری کرنا اور جھوٹ بولنا جیسی عادتوں کو چھڑانے کے لیے بھی پیار محبت اور گفت و شنید سے کام لینا چاہیے۔ دیکھیے چوری اور جھوٹ بولنے سے متعلق عادت کی ایک دو مثالیں۔

چوری اور جھوٹ: کہتے ہیں کہ بچہ غصے اور بغاوت کے جذبات کے تحت جھوٹ بولنے اور چوری کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بول کر اور چوری کر کے اپنے دبے جذبات کو تسکین دیتا ہے۔ یہ دونوں عادتیں بہت بری ہیں لیکن موجودہ دور میں کون ہے جو ان دونوں بری عادتوں سے پاک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ہر شخص کہیں نہ کہیں سنجیدگی یا غیر سنجیدگی سے تھوڑا بہت جھوٹ ضرور بولتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں چوری بھی کر لیتا ہے اس کے باوجود دوسرے کے جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بچے کو جھوٹ بولنا اور چوری کرنا ہم خود ہی سکھاتے ہیں۔ اس بری عادت کو چھڑانے کے لیے بھی ہمارا یہی مشورہ ہے کہ جھوٹ کا پتا لگنے پر خفگی' مایوسی اور نفرت کا اظہار نہ کیا جائے۔ بچہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے وجود کو منوانے کے لیے کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ خارجی طاقت'' اور دباؤ اس کو اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ چوری کرنا اور جھوٹ بولنا برا ہے لیکن وہ جھوٹ بھی بولتا ہے اور چوری بھی کرتا ہے کیوں؟ محض اپنی خوشی اور کامیابی کے اظہار کے لیے۔ وہ اس قسم کے جو کام کرتا ہے اُن کا مقصد اس کے غصے اور بغاوت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک لڑکے کا حال سنیے۔ وہ ہمارے عزیزوں میں سے تھا۔ اُس نے مسجد کا پنکھا چوری کر لیا تھا۔ ایک روز ہم نے اُس نوجوان لڑکے سے بات چیت کی۔ اس کو اپنا تعلق سمجھایا۔ اس بات چیت کے دوران اس لڑکے نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنی سوتیلی والدہ کے ناپسندیدہ سلوک اور بدمزاجی کی وجہ سے گھر سے فرار ہو گیا۔ اس کے والد نے اس کے فرار ہونے پر کوئی تشویش ظاہر نہ کی اور نہ ہی کہیں تلاش کرایا۔ گھر سے فرار ہونے کے بعد وہ دوسرے گانو میں جا کر اپنی نانی کے پاس رہنے لگا اور چند سال بعد اپنے گھر واپس آ کر سائیکلوں کی مرمت کا کام کرنے لگا۔ تبلیغی جماعت کے کارکنوں کی صحبت ملنے پر نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگا۔ ایک روز گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے محلے کی مسجد میں جماعت ہونے کے بعد پہنچا اور اس نے مسجد کا پنکھا چلا لیا۔ مسجد کے امام صاحب کو اس کی یہ کوشش مسجد کے پنکھے کے استعمال سے متعلق اصولوں کے خلاف

معلوم ہوئی۔ انھوں نے یہ کہہ کر پنکھا بند کرادیا کہ مسجد کا پنکھا صرف جماعت سے نماز پڑھنے والے نمازیوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ امام صاحب کی یہ بات سن کر اس کو بہت غصہ آیا لیکن اس وقت تو غصہ کا اظہار نہیں کیا مگر رات میں جاکر مسجد کا پنکھا نکال لایا اور کہیں باہر جاکر اونے پونے داموں میں کسی کے ہاتھ فروخت کر کے خوش ہو گیا۔

اس مثال سے ثابت ہوا کہ پنکھے کی چوری غصے اور بغاوت کے جذبے کے تحت کی گئی۔

چوری کی عادت چھڑانے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو جائے کہ بچے نے چوری کی ہے تو اس سے چوری کا سامان لے کر اس کے مالک کو واپس کر دیا جائے اور چوری کرنے والے بچے کو یہ محسوس کرایا جائے کہ چیزوں کی چوری ہو جانے پر ان کے مالک کو تکلیف ہوتی ہے اور چوری کرنے والا خود اپنی جگہ پریشان ہوتا ہے۔ بچے کو دوسروں کے سامنے کبھی چور نہ کہا جائے اور نہ ہی اس کی چوری کا ذکر کسی دوسرے سے کیا جائے۔ حتی الامکان اس کی عزت کی جائے اور اس کے فعل کو غیر سماجی قرار دیا جائے۔

اسی طرح جھوٹ بولنے والے بچے کو ڈانٹنے ڈپٹنے کے بجائے محبت، عزت اور ہمدردی کے ساتھ اپنے قریب لایا جائے۔ جھوٹ بولنے کی عادت کو ایک عام عادت بتا کر اس کے برے نتائج سمجھائے جائیں۔ بچہ اس بات کو اس وقت خوب سمجھتا ہے جب کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ جھوٹ بول کر اسے دھوکا دے جاتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ گھر اور اسکول میں جھوٹ بولنے کی کوئی مثال نہ مل سکے۔

خلاصہ

لازمی نتائج پر مبنی طریقہ بہ شرطیکہ اس کو مذکورہ بنیادی اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ڈسپلن کی تربیت کے لیے بے حد مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طریقے میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ یہاں مسئلے کو بچے کی نفسیات اور دلچسپی کی روشنی میں حل کیا جاتا ہے۔ اس میں نصیحت کرنے، خیالی پلاؤ پکانے یا محض تقریر کرنے کی بالکل گنجایش نہیں۔ دراصل یہ طریقہ تجرباتی طریقہ ہے اور ہر تجربہ نہ صرف زندگی سے قریب بلکہ زندگی سے متعلق اور مربوط ہوتا ہے۔ اس میں بچے کو فوراً اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنے کا موقع دیا جاتا ہے اور اس طریقے سے جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور زندگی میں کام آتا ہے۔

بظاہر یہ طریقہ نہایت سادہ اور آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا استعمال خاصا دشوار

ہے۔ اس کے استعمال میں اکثر تجربے کار اور بالغ النظر والدین اور اساتذہ سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ جو والدین اور اساتذہ بچوں کی نفسیات یا فطرت سے ناواقف ہوتے ہیں اور جن کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ بچے کی شخصیت والدین کے طرزِ زندگی اور طرزِ عمل سے متاثر ہوتی ہے وہ آسانی سے یہ بات نہیں تسلیم کر پاتے کہ مذکورہ طریقہ ڈسپلن کی تربیت کے لیے مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتا ہے اور اس طریقے سے ڈسپلن کی تعلیم و تربیت پانے والے بچے پر امن اور باضابطہ طریقے پر زندگی بسر کرنے کا فن سیکھ لیتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ سزا اور انعام کا طریقہ جمہوری طرزِ زندگی بسر کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس لازمی نتائج پر مبنی طریقے کے استعمال سے بچوں میں خود کو سمجھنے، خود پر بھروسا کرنے، دوسروں کی مدد کرنے، دوسروں کی مدد حاصل کرنے، دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے اور انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی عادت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طریقے میں بچوں کو خود سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں ایک دوسرے کی عزت کرنے، ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنے اور باہمی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس طریقے کے استعمال سے بچوں کو جمہوری طرزِ زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔

یہ دعوا کرنا تو نامناسب ہوگا کہ ڈسپلن کی تربیت اور ڈسپلن سے متعلق مسئلوں کو حل کرنے کے لیے لازمی نتائج پر مبنی طریقہ ہی واحد طریقہ ہے لیکن یہ کہنا بجا ہوگا کہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس طریقے کو صرف پہلا قدم سمجھا جائے اور اس کو استعمال کرتے وقت بچے کے ساتھ بے بنیاد اور بے مقصد بحث و مباحثہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اسے کبھی ایسا موقع دیا جائے جس میں دوبدو سوال جواب کرنے کا امکان ہو۔ بچے کو غصے کی حالت میں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اس کے غصے کو دیکھ کر خود کو غصے نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی قسم کی پریشانی اور مایوسی کا اظہار کیا جائے۔ بچے کی اکثر شرارتیں اور ضدیں صرف اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک اسے یہ یقین رہتا ہے کہ والدین کی ہمدردی اور پشت پناہی اس کے ساتھ ہے۔

خود آموزڈ سپلن کی شناخت

گزشتہ ابواب میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ بچہ عہد طفولیت میں پوری طرح دوسروں کی مدد اور سہارے کا محتاج رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی عمر کی مختلف منزلیں۔۔۔ بچپن، لڑکپن، نوبالغی اور بالغی، ماں باپ اور استادوں کی نگرانی اور رہنمائی میں طے کرتا ہوا اس قابل ہو جاتا ہے کہ سماج میں آزادی کے ساتھ خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔

آزاد اور خوش گوار زندگی ملتی ہے خود آموزڈ سپلن سے اور خود آموزڈ سپلن کی تربیت کے لیے ماں باپ اور استادوں کو ان گنت کٹھنائیوں اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو ڈسپلن کے ایسے مشکل مسئلے پیش آتے ہیں کہ ماں باپ اور استاد مایوس اور دل برداشتہ ہو کر کفِ افسوس ملنے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ڈسپلن کی تربیت کا کام بڑا ہی دیر طلب اور صبر آزما کام ہے۔ بچے کی نشو و نما دھیرے دھیرے، منزل بہ منزل اور مسلسل ہوتی ہے۔ وہ طفولیت کے بعد ایک دم بلوغت کے دور میں نہیں داخل ہو سکتا۔ وہ تو طفولیت اور بلوغت کے درمیانی طویل سفر کو اپنی فطرت کے مطابق رفتہ رفتہ طے کرتا ہے اور سفر کی کٹھنائیوں، لغزشوں اور مایوسیوں پر قابو پانے کے لیے ماں باپ اور استادوں کی محبت، شفقت اور رہنمائی کا محتاج رہتا ہے اور صحیح رہنمائی ملنے پر ہی وہ اچھا سماجی انسان بنتا ہے۔

ماں باپ اور استادوں کو خود آموزڈ سپلن کی تربیت میں پریشانیاں ضرور برداشت کرنا ہوتی ہیں لیکن یہ پریشانیاں ان ماں باپ اور استادوں کو نہیں ہوتیں جو یہ جانتے ہیں کہ بالیدگی اور نشو و نما کا عمل ایک دم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اور متواتر ہوتا رہتا ہے۔ اس میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور بچے کو جتنی رہنمائی، تعلیم اور ہمت افزائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ عام تعلیم کی طرح ایک سانس میں یا ایک سال میں نہیں دی جاسکتی۔ یہ تو ضرورت اور وقت

کے مطابق دی جاتی ہے اور بعض اوقات ایسے نازک اور پیچیدہ مسئلے پیش آجاتے ہیں جن کو حل کرنے میں انھیں ماہر امراض دماغی (Psychiatrist) اور دیگر ماہرین سے مدد لینا ہوتی ہے۔

مختصر اور آخری بات یہ ہے کہ جس بچے کو شروع ہی سے ماں باپ اور استاد سے بے لوث اور غیر مشروط محبت ملتی ہے۔ جس کو ماں باپ اور استاد سے اس کی فطرت اور ضرورت کے مطابق بروقت رہنمائی حاصل ہوتی ہے' وہ اپنی بالیدگی اور نشوونما کے سفر کو نہایت اطمینان اور آرام سے طے کرتا ہے۔ وہ بڑی آسانی اور خوش اسلوبی سے ایک منزل کے بعد دوسری منزل کو طے کرتا ہوا سنِ بلوغ میں داخل ہوتا ہے اور اپنے من کی موجوں اور جذبات پر قابو پاکر باضابطہ زندگی بسر کرتا ہے اور سماج میں اچھا اور منضبط انسان (Disciplined Person) کہلاتا ہے۔

اچھا اور منضبط انسان

یوں تو پہلے بھی خارجی اور داخلی ڈسپلن اور اس کے اثرات کے بارے میں بتایا جاچکا ہے لیکن خاص طور سے یہ نہیں بتایا گیا کہ اچھے اور منضبط سماجی انسان کی کیا پہچان ہوتی ہے۔ کردار کی کن خوبیوں کی وجہ سے کسی کو اچھا انسان کہا جاتا ہے۔ دراصل اچھا اور سمجھ دار انسان ہی اچھا سماجی انسان کہلاتا ہے۔ اس میں اپنی عمر کے اعتبار سے جذباتی' سماجی اور ذہنی پختگی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ انیس بیس برس کا ہونے کے باوجود بچکانہ حرکتیں کرتا رہے۔ اس کے کردار کے چند مخصوص اوصاف یہ ہیں :

۱۔ وہ خود بیں ہونے کے باوجود یہ نہیں بھولتا ہے کہ سماجی زندگی ایک دوسرے کی مدد کی محتاج رہتی ہے۔ ایک کو دوسرے کی مدد درکار ہوتی ہے۔

۲۔ وہ خوددار ہوتا ہے۔ اپنی خوبیوں اور خرابیوں سے خوف واقف ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں مجموعی طور پر توازن ہوتا ہے۔

۳۔ وہ اپنی ذات سے بھی محبت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی خوب محبت کرتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی عزت اور خوشی کا بھی خیال رہتا ہے۔

۴۔ اس میں صورتِ حال کو صحیح طور پر سمجھنے اور جانچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ جو